بِسمِ اللهِ الرَّحمٰنِ الرَّحِيم

تالیف: آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی اور دیگر علماء ودانشور

کلامِ امیر المومنین علی علیہ السلام

نہج البلاغہ کی جدید، جامع شرح اور تفسیر

(جلد اوّل)

ترجمہ زیر نگرانی

حجۃ الاسلام مولانا سیّد شہنشاہ حسین نقوی

پیشکش

باب العلم دار التحقیق، مسجد باب العلم

فروغِ ایمان ٹرسٹ، شمالی ناظم آباد، بلاک ڈی، کراچی، پاکستان

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں۔

نام کتاب ..... کلام امیر المومنین علی علیہ السلام

جلد ..... اوّل

مؤلف ..... حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی دام ظلہ

معاونین ..... حجۃ الاسلام محمد جعفر امامی، حجۃ الاسلام محمد رضا آشتیانی
حجۃ الاسلام محمد جواد ارسطا، حجۃ الاسلام ابراہیم بہادری
حجۃ الاسلام سعید داؤدی، حجۃ الاسلام احمد قدسی

ترجمہ ..... بابُ العلم دار التحقیق (فروغ ایمان ٹرسٹ) کراچی، پاکستان

زیر نگرانی ..... حجۃ الاسلام مولانا سیّد شہنشاہ حسین نقوی

تعداد ۱۰۰۰

طبع ..... اوّل

تاریخ اشاعت ..... ستمبر ۲۰۱۶ء بطابق روز عید غدیر ۱۸ ذی الحجہ ۱۴۳۷ ھجری

ناشر ..... مصباح القرآن ٹرسٹ

مطبع .....

ہدیہ .....

ملنے کا پتہ

معراج کمپنی

LG-3 بیسمنٹ میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور۔

فون: 0321-4971214/0423-7361214

باب العلم دار التحقیق

مسجد باب العلم بلاک ڈی، شمالی ناظم آباد، کراچی، پاکستان

انتساب

بہ روحِ پرفتوح

محسن علم وادب وثقافت اسلامی،

شریف اجل

ذوالمنقبتین

رضی ذوالحسبین

سید محمد الشریف الرضی رحمۃ اللہ علیہ

فہرست مطالب

عرض ناشر ۱۹
وجہ تالیف کتاب ۲۱
عرض مترجم ۲۵
پیش لفظ ۲۹
سیّد رضیؒ مدوّنِ نہج البلاغہ ۳۱
سیّد رضیؒ کے اساتذہ ۳۲
سیّد رضیؒ کے شاگرد ۳۳
سیّد رضیؒ کی تالیفات ۳۳
سیّد رضیؒ اور شعر ۳۴
سیّد رضیؒ کے القاب اور ان کی سماجی شخصیّت ۳۴
سیّد رضیؒ کے متعلق دانشوروں کے اقوال ۳۵
سیّد رضیؒ کی وفات ۳۶
نہج البلاغہ اور اُس کے خالق کے بارے میں ۳۷
کلام مولا علیہ السلام کی تجلیاں ۳۹
نہج البلاغہ کی فصاحت و بلاغت ۳۹
نہج البلاغہ کے عظیم و عمیق مطالب ۴۵
نہج البلاغہ کی بے مثال جاذبیت ۵۰
نہج البلاغہ کی جاذبیت اور اہم شخصیات کی تعبیرات ۵۲
نہج البلاغہ کی اسناد ۵۴
نہج البلاغہ کی شرحیں ۵۷
''تمہید از سیّد رضیؒ قدس سرہ'' ۵۹

پہلا خطبہ

شرح و تفسیر ۶۵
اُس کی ذات کی بلندی تک فکر کی پرواز ممکن نہیں ۶۵
خدا کی پہلی صفت ۶۵

خدا کی دوسری صفت ۶۷
خدا کی تیسری صفت ۶۸
شرح وتفسیر ۷۲
توحید ذات وصفاتِ الٰہی ۷۲
شرح وتفسیر ۸۱
اُس جیسی کوئی چیز نہیں ۸۱
نکات ۸۶
۱۔مخلوق اور خالق کا رابطہ اور وحدتِ وجود کا مسئلہ ۸۶
۲۔صفاتِ خدا کی حقیقت سے جاہلانہ اِنحراف ۸۹
۳۔اُس کی پاک ذات سے حدوثِ ذاتی اور زمانی کی نفی کرنا ۹۲
۴۔خداوند عالم کے لیے لفظ ''موجود'' کا استعمال ۹۳
شرح وتفسیر ۹۴
دنیا کی تخلیق سے گفتگو کا آغاز ۹۴
نکتہ ۹۸
موجوداتِ عالم کی فکری اور تکوینی ہدایت ۹۸
چند نکات ۱۰۰
۱۔خدا پر لفظ ''عارف'' کا اطلاق ۱۰۰
۲۔خلقت سے قبل مخلوقات کے بارے میں علم الٰہی ۱۰۱
شرح وتفسیر ۱۰۳
آغاز تخلیقِ عالم ۱۰۳
ایک نکتہ ۱۰۵
کیا مادّی دنیا حادث ہے؟ ۱۰۵
شرح وتفسیر ۱۰۷
پانی، سب سے پہلی مخلوق ۱۰۷
ضروری وضاحت ۱۰۸
شرح وتفسیر ۱۱۲
دنیا کی پیدائش میں طوفانوں کا کردار ۱۱۲
چند نکات ۱۱۶

اس موضوع پر جدید نظریات ۱۱۶
دنیا کیسے خلق ہوئی؟ ۱۱۸
نزولِ قرآن کے دور میں تخلیق کائنات کے متعلق مفروضے ۱۱۹
سات آسمانوں سے مراد کیا ہے؟ ۱۲۱
ان امور پر حضرت علیؑ کی دسترس ۱۲۳
شرح وتفسیر ۱۲۴
فرشتوں کا عالم ۱۲۴
اعمال ثبت کرنے والے فرشتوں کا کیا فائدہ؟ ۱۳۰
نکات ۱۳۱
فرشتے کیسے ہوتے ہیں؟ ۱۳۱
اقسام واوصافِ ملائکہؑ ۱۳۳
عرش وحاملانِ عرشِ الٰہی ۱۳۴
فرشتوں کا معصوم ہونا ۱۳۶
حاملانِ عرش کا مقامِ معرفت ۱۳۷
شرح وتفسیر ۱۳۸
آدمؑ کی خلقت کا آغاز ۱۳۸
پہلا مرحلہ: جسم وروح کے اعتبار سے حضرت آدمؑ کی خلقت ۱۳۸
دوسرا مرحلہ: روح پھونکنے کا مرحلہ ۱۴۰
اہم نکات ۱۴۴
حضرت آدمؑ کی تخلیق ۱۴۴
جسم اور روح کی ترکیب ۱۴۵
انسان، کائنات کا عجوبہ ۱۴۷
شرح وتفسیر ۱۴۸
ابلیس کی گمراہی کا آغاز ۱۴۸
اہم نکات ۱۵۲
مقامِ انسانی کی عظمت ۱۵۲
حضرت آدمؑ کے لیے سجدے کی کیفیت کیا تھی؟ ۱۵۲
شیطان کی خلقت سے متعلق مختلف سوالات ۱۵۳

جاہلوں کی بے بنیاد تاویلیں ۱۵۷
شرح وتفسیر ۱۵۹
حضرت آدمؑ کی عبرت انگیز داستان ۱۵۹
نکات ۱۶۴
۱۔حضرت آدمؑ کی جنّت کون سی تھی؟ ۱۶۴
۲۔کیا حضرت آدم علیہ السلام گناہ کے مرتکب ہوئے؟ ۱۶۵
۳۔وہ ممنوعہ درخت کیا تھا؟ ۱۶۷
۴۔حضرت آدم علیہ السلام کو توبہ کے لیے سکھائے گئے کلمات ۱۶۸
شرح وتفسیر ۱۷۱
پیغمبروں کی بعثت اوران کی عظیم ترین ذمّے داریاں ۱۷۱
نکات ۱۷۷
۱۔پیغمبرؑ باغبان کی مانند ہیں ۱۷۷
۲۔وہ حادثات جو بیدار کرتے ہیں ۱۷۸
۳۔انسانی زندگی میں دِین کا کردار ۱۷۸
۴۔ہر زمانے میں حجّت خدا کا ہونا ضروری ہے ۱۷۹
۵۔پیغمبروں کی خصوصیات ۱۸۰
شرح وتفسیر ۱۸۲
ظہورِ اسلام ۱۸۲
اہم نکات ۱۸۵
پہلا نکتہ: بعثت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قبل ادیان ومذاہب ۱۸۵
غیر معطّلہ ۱۸۶
برناڈ شا انگریز فلسفی لکھتا ہے: ۱۸۸
دوسرا نکتہ: انبیائے کرامؑ کا آئندہ کے لیے فکرمند ہونا ۱۸۸
شرح وتفسیر ۱۹۰
قرآن کی خصوصیات ۱۹۰
چودہ نکات ۱۹۰
۱۔حلال اور حرامِ الٰہی ۱۹۰
۲۔ناسخ ومنسوخ ۱۹۱

۳۔مباح اور ممنوع ۱۹۱
۴۔خاص وعام ۱۹۲
۵۔وعظ ونصیحت ۱۹۳
۶۔مطلق ومقید ۱۹۴
۷۔محکم اور متشابہ آیات ۱۹۵
۸۔ایک اور خاصیت ۱۹۶
۹۔جہالت کا سہارا ۱۹۶
۱۰۔جزوقتی احکام ۱۹۷
۱۱۔ایک عمل سنّت میں واجب، لیکن آیات میں متروک ۱۹۷
۱۲۔واجبِ موقّت ۱۹۸
۱۳۔گناہان ۱۹۸
۱۴۔قلیل اعمال مقبول اور زیادہ کی اجازت ۱۹۹
نکات ۲۰۰
۱۔ قرآن مجید کی جامعیت ۲۰۰
۲۔قرآنِ کریم کا علم کس کے پاس ہے؟ ۲۰۱
۳۔کبیرہ وصغیرہ گناہوں کے پہچاننے کا معیار ۲۰۲
۴۔ناسخ ومنسوخ اور ان کا فلسفہ ۲۰۳
۵۔قرآن مجید کے واقعات اور خوبصورت مثالیں ۲۰۴
شرح وتفسیر ۲۰۶
خطبے کا آخری حصّہ، حج کی عظمت ۲۰۶
نکات ۲۱۱
۱۔خانۂ کعبہ کی تاریخ ۲۱۱
۲۔فلسفۂ حج ۲۱۳

دوسرا خطبہ

خطبہ ایک نگاہ میں ۲۱۸
وہ حالات جن میں یہ خطبہ دیا گیا ۲۱۸
شرح وتفسیر ۲۲۰
اسلام کے دو بنیادی ارکان ۲۲۰

اہم نکات ۲۲۵
۱۔توحید، تمام نیکیوں کی جڑ ۲۲۵
۲۔امیر المومنینؑ کی زندگی میں توحید خالص کی تجلی ۲۲۷
شرح وتفسیر ۲۲۹
زمانۂ جاہلیت کا ایک خاکہ ۲۲۹
نکتہ ۲۳۶
دورِ جاہلیت میں لوگوں کی بے حس ومردہ زندگی ۲۳۶
شرح وتفسیر ۲۴۱
آلِ محمد علیہم السلام کا عظیم رتبہ ۲۴۱
چند اہم نکات ۲۴۵
۱۔خاندانِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امتِ اسلامی کی پناہ گاہ ۲۴۵
۲۔آلِ محمد علیہم السلام کون ہیں؟ ۲۴۶
شرح وتفسیر ۲۴۷
اہلِ بیت علیہم السلام کا کوئی ہم پلّہ نہیں ۲۴۷
دو اہم نکات ۲۵۴
۱۔قرآن وحدیث کی روشنی میں عظمتِ اہلِ بیتؑ ۲۵۴
۲۔نامعقول توجیہات! ۲۵۶

تیسرا خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں ۲۶۰
شرح وتفسیر ۲۶۳
مسئلۂ خلافت کے بارے میں اہم تجزیہ ۲۶۳
تاریخی نکات ۲۷۱
۱۔امام علی علیہ السلام نے صبر کو کیوں ترجیح دی؟ ۲۷۱
۲۔خلافت کو ''میراث'' کا نام کیوں دیا گیا؟ ۲۷۲
۳۔حضرت امام علیؑ اور گوشہ نشینی ۲۷۴
۴۔امام المتقینؑ نے خلافت کے مسئلے کو کیوں اٹھایا؟ ۲۷۴
شرح وتفسیر ۲۷۷
خلیفۂ دوّم کا دور ۲۷۷

ایک سوال کا جواب: ۲۸۱
چند نکات ۲۸۹
۱۔ خلیفۂ دوّم کا انداز اور طریقۂ کار ۲۸۹
۲۔ عذر خواہیاں ۲۹۲
۳۔ ایک سوال اور اُس کا جواب ۲۹۵
شرح و تفسیر ۲۹۶
خلیفۂ سوّم کا دور حکومت ۲۹۶
۱۔ خلیفۂ دوّم اور سوّم کے انتخاب کا طریقہ ۳۰۱
۲۔ ابولؤلؤ کا واقعہ اور خلیفۂ سوّم کی حکومت کا آغاز ۳۰۲
۳۔ چھے آدمیوں کی شوریٰ اور اس کا انجام ۳۰۳
۴۔ خلیفۂ سوّم کے خلاف تحریک کی وجوہات ۳۰۵
۵۔ کیا تمام صحابہ، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راستے پر گامزن رہے؟ ۳۰۸
شرح و تفسیر ۳۱۰
بیعت کے موقع پر حضرت امام علی علیہ السلام کا خطبہ ۳۱۰
آخرت کو متاعِ دنیا کے عوض ہاتھ سے کھو دیا ۳۱۴
نکات ۳۱۵
۱۔ حضرت علیؑ کی بیعت عمومی تھی ۳۱۵
۲۔ اجتماعی انحرافات کا سرچشمہ ۳۱۶
۳۔ حضرت علیؑ کے دور میں تین جنگوں کی طرف اشارہ ۳۱۷
جنگ جمل ۳۱۷
جنگ صفین ۳۱۸
جنگ نہروان ۳۲۰
شرح و تفسیر ۳۲۱
میں نے خلافت اور بیعت کیوں قبول کیا؟ ۳۲۱
شرح و تفسیر ۳۲۵
اہم نکات ۳۲۸
ایک سوال کا جواب ۳۲۸
اس خط میں کون سے سوالات تھے؟ ۳۲۸

خطبۂ شقشقیہ کی خصوصیات.....۳۳۱

چوتھا خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں.....۳۳۵
شرح وتفسیر.....۳۳۶
اپنی آنکھیں اور کان کھول دیں.....۳۳۶
نکتہ.....۳۳۹
ہدایت خاندانِ وحی کے سائے میں.....۳۳۹
شرح وتفسیر.....۳۴۰
تمہاری عہد شکنی جانتا تھا، مگر!!!.....۳۴۰
نکات.....۳۴۳
۱۔ باطنی بصیرت.....۳۴۳
۲۔ لوگوں کے عیبوں پر پردہ ڈالنا.....۳۴۵
شرح وتفسیر.....۳۴۶
آج میں حقائق کو آشکار کرتا ہوں.....۳۴۶
نکتہ.....۳۴۹
حق اور باطل کی جنگ.....۳۴۹

پانچواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں.....۳۵۱
شرح وتفسیر.....۳۵۲
فتنہ برپا کرنے والوں سے ہوشیار رہو.....۳۵۲
چار اہم نکات.....۳۵۳
پہلا نکتہ.....۳۵۳
دوسرا نکتہ.....۳۵۴
تیسرا نکتہ.....۳۵۵
چوتھا نکتہ.....۳۵۶
نکتہ.....۳۵۷
پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد امام علی علیہ السلام نے کیوں قیام نہیں کیا؟.....۳۵۷

شرح وتفسیر ۳۵۹
اِن بہانہ ڈھونڈنے والوں سے کیا برتاؤ کیا جائے؟ ۳۵۹
نکات ۳۶۱
امام علیہ السلام کی بہادرانہ جدوجہد ۳۶۱
میں موت سے کیوں ڈروں؟ ۳۶۲
میں کیوں خاموش ہوا؟ ۳۶۳

چھٹا خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں ۳۶۵
شرح وتفسیر ۳۶۶
دشمن کے مقابل غفلت کا شکار نہیں ہونا چاہیے ۳۶۶
نکتہ ۳۶۹
تمام ذمّے داروں کے نام پیغام ۳۶۹

ساتواں خطبہ

شرح وتفسیر ۳۷۱
شیطان کے پیروکار ۳۷۱
شیاطین کے بارے میں اہم نکتہ ۳۷۵

آٹھواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں ۳۷۹
شرح وتفسیر ۳۸۰
عُذرِ گناہ بدتر از گناہ ۳۸۰

نواں خطبہ

شرح وتفسیر ۳۸۳
کھوکھلے نعرے بازی ۳۸۳
نکات ۳۸۵
۱۔ باعمل لوگ ۳۸۵
۲۔ شوروغل اور مفید ومؤثر تبلیغات کے درمیان فرق ۳۸۷

دسواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں ۳۸۹
شرح وتفسیر ۳۹۰
مسلمانوں کے لیے انتباہ ۳۹۰
نکتہ ۳۹۳
شیطان کے لشکر ۳۹۳

گیارہواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں ۳۹۵
شرح وتفسیر ۳۹۷
چٹان کی طرح کھڑے رہو ۳۹۷
نکات ۴۰۰
حضرت محمد بن حنفیہؒ کون ہیں؟ ۴۰۰
دشمن پر فتح پانے کی اہم ترین شرائط ۴۰۲

بارہواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں ۴۰۳
شرح وتفسیر ۴۰۴
مکتب کا رشتہ ۴۰۴
اہم نکتہ ۴۰۶
محکم ترین رشتے داری ۴۰۶

تیرہواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں ۴۱۲
شرح وتفسیر ۴۱۲
جنگ جمل کی افواج کے اوصاف ۴۱۲
نکات ۴۲۰
پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جنگ جمل کے بارے میں پیش گوئی ۴۲۰
اہل بصرہ کی مذمّت ۴۲۲

دائرۂ اخلاق کی تاثیر ۴۲۳

چودھواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں ۴۲۵
شرح وتفسیر ۴۲۶
پھر اہلِ بصرہ کی مذمّت ۴۲۶

پندرھواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں ۴۲۹
شرح وتفسیر ۴۳۰
خدا کی قسم، غصب شدہ مال کو واپس لوٹاؤں گا ۴۳۰
نکات ۴۳۲
انسانی معاشرے میں عدل کے آثار ۴۳۲
خلیفۂ سوّم کی عجیب بخششیں ۴۳۴
ایک اہم سوال کا جواب ۴۳۵

سولھواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں ۴۳۸
شرح وتفسیر ۴۳۹
ہوشیار ہو جاؤ! بڑی آزمائش کا سامنا ہے ۴۳۹
نکات ۴۴۳
تاریخ اپنے آپ کو دوہراتی ہے ۴۴۳
حقیقت کا بیان یا مصلحت کی رعایت ۴۴۳
شرح وتفسیر ۴۴۵
گناہ سرکش گھوڑوں کی مانند ہیں ۴۴۵
شرح وتفسیر ۴۵۱
راہِ نجات یہ ہے ۴۵۱
چند نکات ۴۵۸
جاہل وہ ہے جو اپنی قدر نہ جانے ۴۵۸
اعتدال، اللہ کا سیدھا راستہ اور صراط مستقیم ہے ۴۶۰

سترہواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں ۴۶۴
شرح وتفسیر ۴۶۴
تمام مخلوقات میں ناپسندیدہ ترین افراد کون لوگ ہیں؟ ۴۶۴
چند نکات ۴۷۰
بدعت کیا ہے اور اسے ایجاد کرنے والا کون ہے؟ ۴۷۰
خطرناک ترین گناہ، دوسروں کے گناہوں کا بوجھ اپنے کاندھوں پر لادنا ۴۷۲
شرح وتفسیر ۴۷۴
عالم نُما جاہل ۴۷۴
چند نکات ۴۸۵
علمائے سُوء اور اُن کے خطرات ۴۸۵
مکڑی کے جال جیسی کمزور معلومات ۴۸۶
چاپلوس مداح (حاشیہ نشین) ۴۸۷
شرح وتفسیر ۴۸۹
نکتہ ۴۹۱
تفسیر بالرائے اور حقائق کی تحریف ۴۹۱

اٹھارہواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں ۴۹۳
شرح وتفسیر ۴۹۴
یہ تمام اختلافات کیوں ہیں؟ ۴۹۴
نکات ۴۹۶
مسئلۂ تصویب کیا ہے اور اس کی ابتدا ۴۹۶
اجتہاد کے دروازے کو بند کر دینا ۴۹۹
عقیدۂ تصویب اور اجتہاد کا دروازہ بند کرنے کے نتائج ۵۰۱
شرح وتفسیر ۵۰۳
ان اختلافات کی توجیہ نہیں کی جاسکتی ۵۰۳
نکتہ ۵۰۶

قرآن میں کس طرح ضرورت کی تمام چیزیں موجود ہیں..... ۵۰۶
شرح وتفسیر..... ۵۱۰
قرآن کی خوشنمائی اور گہرائی..... ۵۱۰
نکات..... ۵۱۲
قرآن واہلِ بیتؑ سے دوری کے بُرے نتائج..... ۵۱۲
قرآن اور جدید مسائل..... ۵۱۶
قرآن کے عجائبات کیوں ختم نہیں ہوتے ہیں؟..... ۵۱۷

اُنیسواں خطبہ

شرح وتفسیر..... ۵۲۰
بے ادب اور جسور منافق سے مُڈبھیڑ..... ۵۲۰
نکات..... ۵۲۶
اتنا سخت برتاؤ کیوں؟..... ۵۲۶
امامؑ نے کیسے اس منافق آدمی کو برداشت کیا؟..... ۵۲۷

بیسواں خطبہ

شرح وتفسیر..... ۵۲۹
بہت جلد پردے اٹھا دیئے جائیں گے..... ۵۲۹
ایک نکتہ..... ۵۳۵
مرنے کے بعد کی دنیا..... ۵۳۵

عرض ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ محسن ملت علامہ سیّد صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ کے ان صدقاتِ جاریہ میں سے ہے، جن سے لوگ تا قیامت استفادہ کرتے رہیں گے اور موصوف کے درجات عالیہ میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ مصباح القرآن ٹرسٹ نے تراجم وتفاسیر قرآن سے کام شروع کیا اور پھر ہر وہ کتاب جس کی ملت کو ضرورت تھی، شائع کی اور انشاء اللہ العزیز شائع کی جاتی رہے گی۔

قرآن و اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات کو عام کرنا اور انہیں گھر گھر پہنچانا ہمارے ادارے ''مصباح القرآن ٹرسٹ'' لاہور کا پہلے روز سے ہدف رہا ہے۔ اس سلسلے میں دسیوں علمی کام جو علمائے کرام کی تالیف وتصنیف اور ترجمے کی صورت میں منظر ومشہود ہیں۔ ان میں حضرت آیۃ اللہ العظمٰی ناصر مکارم شیرازی دام ظلہٗ کی تالیف شدہ ''تفسیرِ نمونہ، تفسیرِ پیامِ قرآن'' سرِ فہرست ہیں۔ ادارہ ہٰذا نے چاہا کہ حضرت آیۃ اللہ العظمٰی ناصر مکارم شیرازی دام ظلہٗ کی شرح نہج البلاغہ ''پیام امام امیر المومنین علیہ السلام'' کا ترجمہ پیش کیا جائے۔ اگرچہ خود حضرت آیۃ اللہ العظمٰی ناصر مکارم شیرازی دام ظلہٗ نے مجھے اجازت دی تھی، یہاں ممنونِ احسان ہیں حجۃ الاسلام والمسلمین الحاج السیّد ذوالقدر رضوی دامت برکاتہٗ (وکیل ونمائندہ آقائی مکارم شیرازی برائے لندن) کے جن سے تحریری اجازت حاصل کر کے ترجمہ کیا گیا ہے۔ امید ہے بہت جلد تمام جلدوں کو پیش کیا جائے گا۔

یاد رہے کہ مصباح القرآن ایک خود مختار ادارہ ہے۔ اس کے بانی مرحوم حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ سیّد صفدر حسین نجفیؒ تھے۔ انہوں نے اس ادارے کا ایک الگ ٹرسٹ تشکیل دیا جو اوّل دن سے اخراجات کا خود انتظام کرتا ہے۔ ادارہ مصباح القرآن ٹرسٹ حجۃ الاسلام مولانا سید شہنشاہ حسین نقوی کا تہہ دل سے مشکور ہے کہ اُنہوں نے شرح نہج البلاغہ کے ترجمہ کی نگرانی کے فرائض از خود انجام دیئے، نیز ادارہ ''باب العلم دار التحقیق'' کا بھی ممنون ہے کہ اُنہوں نے کتابِ ہٰذا کی اشاعت کی اجازت دی۔

مصباح القرآن کی تمام کتابیں آپ کے استفادے کے لیے انٹرنیٹ پر موجود ہیں، جن کا مطالعہ آپ ان ویب سائٹس پر کر سکتے ہیں: www.misbahulqurantrust.com

قارئین کرام سے التماس ہے کہ اگر وہ اس کتاب میں کہیں خامی، کمی یا غلطی محسوس کریں تو ہمیں مطلع فرمائیں، ہم آپ کے شکر گزار رہیں۔ ادارے کی ترقی اور اس کے بانی محسنِ ملت علامہ سیّد صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہٗ کے درجات کی بلندی کے لیے دعا کا طالب

مسئول

مصباح القرآن ٹرسٹ، لاہور، پاکستان

وجہ تالیف کتاب

''اسلامی تعلیمات کا عمیق سمندر'' ''انسان کی تعلیم و تربیت کا اعلیٰ ترین درس''
''خودسازی اور تہذیب نفس کا بہترین سرمایہ''
اور'' پاک و پاکیزہ اور قابلِ فخر معاشرہ بنانے کے بہترین دستور''

یہ عنوانات ہیں جنہیں'' نہج البلاغہ'' کے تعارف کے لیے قرار دیا جا سکتا ہے، صرف وہی شخص اس کے بارے میں گفتگو کر سکتا ہے، جس نے شروع سے آخر تک غور سے اس کا مطالعہ کیا ہو، پھر اس پر واضح ہو جائے گا کہ جو کچھ اس گراں قدر تالیف کے بارے میں کہا گیا ہے، وہ بہت کم ہے۔ میں نے بھی دوسروں کی طرح'' نہج البلاغہ'' کے مختلف حصّوں کا اپنی ضرورت کے مطابق مطالعہ کیا تھا۔ یہاں تک کہ ۱۵ /خرداد ۴۲ شمسی کو بہت سی شخصیات کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا، شروع میں شاہ کی حکومت کی طرف سے بہت سختیاں تھیں، تمام چیزیں ہمارے لیے ممنوع تھیں۔ رفتہ رفتہ مشکلات کم ہوئیں تو دوستوں سے تقاضا کیا کہ ہمارے پڑھنے کے لیے کتابیں فراہم کریں اور میں نے اپنے لیے'' نہج البلاغہ'' کا مطالبہ کیا۔ اس فرصت کو غنیمت جانتے ہوئے نہج البلاغہ کی ترتیب کے مطابق مطالعہ شروع کیا۔ توفیقِ الٰہی شاملِ حال رہی، دوسرے حصّے کا مکمل مطالعہ کیا، جو خطوط اور سیاسی و اخلاقی حکم ناموں پر مشتمل ہے۔ اُس وقت احساس ہوا کہ نہج البلاغہ میرے تصّور سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ اپنے آپ کو علم و دانش کے سمندر کے مقابل پایا۔ زندگی سے متعلق تمام اہم ترین مسائل اور ان کے تمام معنوی اور مادّی پہلو اس میں موجود ہیں، سمندر کی امواج کی طرح جو گوہر اور موتیوں کو لا کر ساحل پر ڈال جاتی ہیں اور غوطہ زن کا اس پر زیادہ حق ہوا کرتا ہے۔ میں اُس دن سمجھا کہ کتنے محروم ہیں وہ افراد جو اس بے مثال گنجینہ کے ہوتے ہوئے اس سے بے خبر ہیں اور دوسروں کی طرف ہاتھ پھیلاتے ہیں، جو چیز خود ان کے پاس موجود ہے۔ اس کی تمنا دوسروں سے کرتے ہیں۔

نہج البلاغہ کی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ جس طرح قرآن کے مضامین زمانے کے گزرنے سے پرانے نہیں ہوتے، اسی طرح اس کے مطالب بھی چاہے وہ سیاسی ہوں یا فکری اور اَخلاقی ہوں، زمانہ گزرنے کے ساتھ پرانے نہیں

ہوتے۔ گویا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج امیر المومنین علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے یہ کلمات جاری ہوئے ہیں۔ مناسب ہوگا کہ عاشق باللہ، سالکِ الی اللہ اور کامیاب زندگی گزارنے والے افراد ہر روز اس بزرگ عالم یعنی علامہ سیّد رضیؒ کی قبر پر حاضر ہوں اور ان کی رُوح پر سلام بھیجیں کہ انھوں نے امیر المومنینؑ کے ایسے گراں بہا کلمات پر مشتمل کتاب ہم مسلمانوں، بلکہ انسانی معاشرے کے حوالے کی ہے۔

نہج البلاغہ کے بارے میں جتنا بھی کہا جائے کم ہے، کیوں کہ اس کا حق ادا کرنا ممکن نہیں۔ بہتر تو یہ ہے کہ اصل مطلب کی طرف بڑھیں، جو اس کتاب کے لکھنے کا سبب ہے اور وہ یہ ہے کہ تاریخ میں نہج البلاغہ کی متعدد شرحیں لکھی گئیں، علمائے گزشتہ اور عصر حاضر کے دانشمندوں نے ہمارے لیے اس کی تفسیر اور حقائق کو ظاہر کرنے کی کوششیں کی ہیں اور قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہج البلاغہ اس طرح ہے کہ گویا ابھی تک کسی نے اس پر نظر ہی نہ ڈالی ہو۔ یہ اب بھی مظلوم ہے اور اس کے لیے مزید کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر اس زمانے میں جب کہ مسائل و مشکلات زیادہ ہیں اور مختلف مکاتبِ فکر اپنے اعتقادات معاشرے پر تھوپنا چاہتے ہیں اور دوسری جانب اخلاق، تقویٰ و پرہیزگاری سے دوری بڑھ رہی ہے، اُدھر دنیا دار لوگ اپنے غیر اخلاقی مقاصد کے حصول میں مصروف ہیں لہٰذا اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ نہج البلاغہ پر زیادہ سے زیادہ کام کیا جائے تاکہ معنوی، مادّی، انفرادی اور اجتماعی مشکلات کا حل پیش کیا جا سکے اور دیگر مکاتب فکر کا مقابلہ کیا جا سکے۔

اسی دلیل کی بنا پر اس توفیق کے بعد جو ''تفسیرِ نمونہ'' اور ''پیامِ قرآن'' کی صورت میں الحمدللہ اس حقیر اور میرے بہترین ساتھیوں کو نصیب ہوئی۔ اہل علم نے اصرار کیا کہ اب نہج البلاغہ کا مرحلہ ہے اور تفسیرِ نمونہ کی طرح اس پر کام کیا جائے اور سابقہ تجربات کی روشنی میں اور بہتر انداز سے خوبصورت اسلوب کے ساتھ اس کام کو انجام دیا جائے۔ جب کہ مسائل ومشکلات پہلے سے زیادہ ہوگئی ہیں اور یہی سبب اس کام کی راہ میں رکاوٹ تھا، لیکن سوچا کہ جب تک عمر باقی ہے اس کام کو انجام دیا جائے، پھر خدا سے توفیق اور حضرت علیؑ سے مدد مانگی، چنانچہ تفسیر نمونہ میں مدد کرنے والے کچھ پرانے ساتھیوں اور کچھ نئے ساتھیوں کے ساتھ مل کر نہج البلاغہ کی شرح مکمل کی، جس میں روزمرہ کے مسائل، فکری، سماجی، عقیدتی ضروریات کا حل ہے۔ اس کے علاوہ گزشتہ شارحینِ نہج البلاغہ سے استفادہ کرتے ہوئے اس میں جدّت اور نئے مطالب کی طرف توجّہ کی گئی ہے۔

یہ کام روزِ ولادتِ باسعادت امیر المومنین علیہ السلام ۱۳ رجب المرجب ۱۴۱۳ھ ہجری قمری میں شروع ہوا، البتہ سُستی کا شکار رہا اور پہلی جلد کو تقریباً تین سال کا عرصہ لگا۔ (شروع میں جلدی میں کام کرنا ویسے بھی صحیح نہیں تھا) لیکن اب الحمدللہ تیزی

سے کام جاری ہے، امید ہے اس سے بھی زیادہ کام میں تیزی آئے گی، لیکن نہج البلاغہ کی موجیں اس قدر عظیم ہیں کہ اس اوقیانوس میں کام کرنا اتنا آسان بھی نہیں۔

بہرحال ہم اسے اہلِ نظر کے ذوقِ مطالعہ پر چھوڑتے ہیں اور صاحبانِ نظر سے درخواست ہے کہ اگر کوئی کمی محسوس کریں تو ہماری توجّہ دلائیں تا کہ اس کام میں وہ بھی حصّہ دار ہوسکیں۔ آیئے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں کہ خداوند عالم ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ اس کام کی تکمیل بہ طریقِ احسن انجام پائے۔ (آمین)

ناصر مکارم شیرازی (قم المقدسہ)
۳ ربیع الثانی ۱۴۱۷ ہجری قمری

عرض مترجم

قرآن مجید اللہ کا وہ کلام ہے جو تمام گزشتہ آسمانی صحیفوں کے بعد اپنی تمام تر جامعیت اور ضرورت کے مطابق پیکر علم الٰہی سرورِ کائنات رحمۃ للعالمین آنحضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کیا گیا جو قیامت تک رہنمائی عطا کرتا رہے گا اور اس کی تفسیر و تفہیم کی ذمے داری بعد از پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عترت و اہل بیت علیہم السلام کو دی گئی۔ چنانچہ ان پاک اور عظیم ہستیوں نے اپنی احادیث، فرامین اور عملی اقدامات کے ذریعے اسے تصویرِ تجسّم عطا کی اور عملی جامہ پہنایا، یعنی اہل بیت علیہم السلام کی روش، ان کے فیصلے اور طرزِ زندگی قرآن کی عملی تفسیر ہے، البتہ اس عظیم سرمائے کو جمع کر کے کتابی شکل دینا ایک اساسی خدمت ہے جسے علاّمہ سیّد شریف رضی علیہ الرحمہ نے اپنے ذوقِ ادبی و علمی کے مطابق جمع کر کے "نہج البلاغۃ" نام دیا جو ایک ہزار سال سے عقلوں کی بیداری و ہدایت، ضمیروں کی سالمیت، فطرت کی اصالت، سماج کی قیادت اور ان سب کے محور اللہ کی عبادت کو فروغ دے رہی ہے۔ مولا علی علیہ السلام کے کلام کا معیار اس درجے کا ہے کہ ادبائے کرام نے متفقہ طور پر تسلیم کیا ہے کہ یہ اللہ کے کلام سے نیچے اور بندوں کے کلام سے اوپر ہے۔

تَحْتَ كَلَامِ الْخَالِقِ وَفَوْقَ كَلَامِ الْمَخْلُوْقِ

مسلم و غیر مسلم علمائے کرام اور اہل ادب نے اسے سمجھنے اور سمجھانے کے لیے سیکڑوں مفصل و موضوعاتی شرحیں، مقالے اور مضامین لکھے، ایسی ہی شروح میں سے ایک مرجع عالی قدر حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی (مدظلہ العالی) اور دیگر علما و دانشوروں کی مرتب کردہ بہترین، سلیس اور نئی شرح "پیام امام امیر المومنین علیہ السلام" ہے۔ نہج البلاغہ اور مولا علی علیہ السلام کی خدمت و نوکری کا کسے شوق نہیں ہوگا۔ چنانچہ مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور کے مسئول محترم جناب سیٹھ محمد امین ساعتی کی فرمائش پر دفتر حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی لندن کے مسئول و نمائندہ محترم عالم بزرگوار حضرت حجۃ الاسلام والمسلمین سیّد ذوالقدر رضوی دامت برکاتہ کی تحریری اجازت اور حضرت آیۃ اللہ علاّمہ سیّد عقیل الغروی دامت برکاتہ سے مفید مشوروں اور رہنمائی کے بعد باب العلم دارالتحقیق، کراچی، پاکستان کے اراکین، مولانا محمد حسین کریمی، مولانا

غلام علی عارفی، مولانا فدا حسین انقلابی، مولانا محمد یعقوب شاہد آخوندی، مولانا منظور حسین ابوالحسنی، جناب مظہر حسنین نقوی (مرحوم)، محترم آغا نادر رضوی، محترم سیّد ذوالفقار حسین نقوی سمیت محترم مرزا محمد علی، محترم محمد مرسلین، محترم ذاکر اسدی، محترم سیّد شہزاد عالم زیدی، محترم ضمیر الحسن جعفری، محترم سیّد سجاد رضا رضوی اور محترم سیّد اسد علی زیدی کی باہمی تعاون سے ترجمے کا کام شروع ہوا جس کی تیسری جلد اب الحمدللہ آپ کے سامنے ہے۔

اس کتاب کے مکمل دورے کے بعد چند جلدوں کا ضمیمہ ترتیب دیا گیا ہے، جس میں روات کا ذکر، جو کہ منہاج البراعہ (خوئیؒ) سے استفادہ ہے اور حوالہ جات بھی مزید بڑھائے جائیں گے۔ اسی طرح قائد ملت جعفریہ علامہ مفتی جعفر حسین اور برصغیر کے بلند مرتبہ علامہ سید ذیشان حیدر جوادی کی شرح کے علاوہ باب العلم دارالتحقیق کی جانب سے معلومات کا اضافہ ہے۔

قابل ذکر ہے کہ کلام امیر المؤمنین علی علیہ السلام میں اردو ترجمہ علامہ مفتی جعفر حسین مرحوم اور علامہ سید ذیشان حیدر جوادی سے لیا گیا ہے۔

نہج البلاغہ کا اگر پوری ملّت مطالعہ کرلے تو یقیناً ترقی و عظمت مسلمین و تشیع میں کئی گنا اضافہ ہوگا اور انشاء اللہ یہ کاوش اس راہ میں مددگار ثابت ہوگی۔ شہید پروفیسر سیّد سبط جعفر زیدی سے اس کتاب کے بارے میں مشورے رہے کہ نہج البلاغہ کا منظوم ترجمہ کیا جائے، چنانچہ اس پر کام شروع کر دیا گیا ہے۔

والسلام

سیّد شہنشاہ حسین نقوی

مدیر باب العلم دارالتحقیق، کراچی، پاکستان

مجوز کا عکس

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

جناب حجۃ الاسلام والمسلمین سید شہنشاہ حسین نقوی دامت معالیکم
ڈائرکٹر ــــــ باب العلم دار التحقیق،
فروغ ایمان ٹرسٹ،
ناظم آباد، کراچی، پاکستان۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

انشاءاللہ العزیز آپ ہر طرح سے بخیر وبعافیت ہوں گے۔

یہ جان کر مجھے بے انتہا مسرت ہو رہی ہے کہ حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ شیخ ناصر مکارم شیرازی کی زیر نگرانی تالیف ہونے والی نہج البلاغہ کی سلیس و نفیس شرح ــــ پیام امامؑ ــــ کا اردو ترجمہ باب العلم دار التحقیق میں آپ کی زیر نگرانی انجام پا رہا ہے۔

حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ شیخ ناصر مکارم شیرازی مدظلہ العالی کے نمائندہ اور اُن کے لندن کے آفس کے مسئول کی حیثیت سے میں آپ کی خدمت میں صمیم قلب سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اور دعا گزار ہوں کہ ربِّ کریم آپ کے توفیقات میں اضافہ فرمائے اور آپ کے مساعی جمیلہ وجلیلہ کو شرف قبول سے سرفراز فرمائے۔

تبلیغ دین اور خدمتِ مکتب ومذہب اہل بیتِ عصمت وطہارت کی غرض سے حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ مکارم شیرازی مدظلہ العالی کی جانب سے آپ کو اُن کی تمام کتابوں کے ترجمہ اور اشاعت کی اجازت حاصل ہے۔ بشرطیکہ اُن کے مضامین اور محتویٰ میں کسی قسم کی تبدیلی واقع نہ ہو۔

میں اس عظیم الشان کتاب کی تکمیل اور اشاعت کے لیے بھی دست بہ دعا ہوں۔ ربِّ اکبر ــــ سبحانہ وتعالیٰ ــــ آپ کے دست وبازو کو قوت وطاقت عطا فرمائے اور اس جیسے کارناموں کے لیے زیادہ سے زیادہ امکانات فراہم فرمائے ــــ آمین بحق محمد وآلہ الطاہرین!

دعا گو
سید ذوالقدر رضوی
مرکز باب المراد
لندن، یو۔کے۔

Babul Murad Centre
856-858 Harrow Road, Sudbury Town, Wembley, Middlesex, London HA0 2PX .U.K
Tel: 0208 908 1525 • Fax: 0208 537 1232 • Answer Phone: 0208 908 0055

مرکز باب المراد - لندن
دفتر حضرت آیت اللہ العظمی
مکارم شیرازی (مدظلہ)
سڈبری، ویمبلی، لندن
انگلستان

Head Office
دفتر حضرت آیت اللہ العظمی
مکارم شیرازی (مدظلہ)
حوزہ علمیہ، قم
جمہوری اسلامی
ایران
Tel: (0098) 251 774 311
(0098) 251 774 312
Fax: (0098) 251 774 311
www.makarem.ir

پیش لفظ

نہج البلاغہ آج کی دنیا میں تصور سے کہیں زیادہ بہتر طریقے سے روشنی پھیلا رہی ہے، کیوں کہ بہت ساری اجتماعی اورانفرادی مشکلات اور دشواریوں کا حل اس میں موجود ہے اور بشریت کی جان لیوا بیماریوں کے لیے دوا اِس میں پوشیدہ ہے۔ نہج البلاغہ کی روشن شعاؤں نے دنیائے اسلام کی سرحدوں کو پار کر کے اب غیر مسلموں کے دلوں کو بھی منور کرنا شروع کر دیا ہے، وہ ایسے فیضیاب ہو رہے ہیں کہ کبھی ان کے ایسے بیانات نہج البلاغہ کے بارے میں آتے ہیں کہ دوستوں کی جان و دل کو جھنجوڑ کے رکھ دیتے ہیں اور شوق کے آنسوؤں کو آنکھوں سے بہا دیتے ہیں۔

ایک عرب عیسائی مفکر میخائیل نعیمہ اپنی کتاب "نہج البلاغہ اور اُس کے صاحب" کے بارے میں لکھتا ہے کہ کیا علیؑ صرف اسلام کے لیے ہے؟ اگر ایسا ہے تو ۱۹۵۶ء میں ایک عیسائی ان کی گزشتہ زندگی کے بارے میں تحقیق و جستجو اور دقت کیوں کرتا؟ یہ جارج جرداق جو ایک لبنانی عیسائی مصنف ہیں جنھوں نے کتاب "اَلْاِمَامُ الْعَلِیُّ صَوْتُ الْعَدَالَۃِ الْاِنْسَانِیَّۃِ" لکھی ہے یہ ان کی طرف اشارہ ہے۔ وہ (امیر المومنینؑ) ایسے دل پذیر شاعر، دل فریب واقعات، نرم اور لطیف حکایات اور حیرت انگیز جنگی واقعات کو شاعرانہ انداز سے پیش کرنے والے، ایک ایسے مردِ میدان، جو نہ صرف جنگ کے میدان میں، بلکہ دور اندیشی اور پاک دلی میں، فصاحت، بلاغت اور سحر انگیز بیانی میں، بہترین اخلاق اور جوشِ ایمانی میں، بلند ہمتی میں، مظلوموں اور ناامیدوں کی مدد کرنے میں، حق اور سچ کی پیروی کرنے میں، من جملہ تمام صفاتِ حسنہ میں ایسے مردِ میدان تھے کہ تاریخ میں آپؑ کی کوئی نظیر نہیں۔

نہج البلاغہ کی کشش اس حد تک ہے کہ سخت پیاسی ارواح کو اپنی شفاف حقیقت سے ایسا سیراب اور مست کر دیتی ہے کہ وجودِ انسان سے شراب طہور کے نشے کے تمام اثرات آشکار ہو جائیں، گویا حوض کوثر ہے اور مولا علیؑ ساقی کوثر کنارے پر بیٹھے ہر کسی کو اس کی قابلیت کے مطابق فائدہ پہنچاتے ہیں۔ مگر افسوس! کہ نہج البلاغہ کی تفسیر و تشریح اور معانی کی وضاحت کے بارے میں مسلمان دانشوروں نے گروہی شکل میں اگر چہ بہت کوششیں کی ہیں، مگر اب بھی گہری اور بیشتر تشریحات کی

ضرورت ہے۔ پہلے زمانے میں بزرگان دین نے اپنے حساب سے عمدہ لیکن محدود شرحیں لکھی ہیں، مگر آج کی دنیا کو تازہ اور تفصیلات کے ساتھ شرحیں درکار ہیں، اسی بنا پر تفسیر نمونہ کا کام ختم کرنے کے بعد، مولا امیر المومنین علیہ السلام کی عنایات اور مدد سے مالی مشکلات کے باوجود ہم نے نہج البلاغہ کی مکمل شرح وتفسیر کا ارادہ کیا۔ اس امید کے ساتھ کہ اس کتاب سے دانشور حضرات، علما، فضلا، محققین اور عام لوگ بھی استفادہ کر سکیں۔

اس شرح وتفسیر کے لیے مندرجہ ذیل نکات پر خصوصیت کے ساتھ کام کیا گیا ہے۔

۱۔ اس کے ساتھ تمام جملوں کا ترجمہ وتفسیر۔

۲۔ تمام لغات اصلی وغیر لغات کی تفسیر۔

۳۔ خطبوں اور خطوط سے مربوط تاریخی مسائل کے بیان کی اہمیت۔

۴۔ مختلف عقیدتی، اخلاقی، اجتماعی اور سیاسی۔۔۔بحثوں پر ضروری تجزیہ وتحلیل۔

۵۔ اضافی نکات جن پر مکمل بحث کی گئی ہے، جو شاید محترم پڑھنے والوں کو دوسری کتابوں کی طرف رجوع کرنے سے بے نیاز کر دے۔

بحمد اللہ اس کام میں ہمارے ساتھ کچھ نئے ساتھیوں اور تفسیر نمونہ میں کام کرنے والے ساتھیوں نے مدد کی، جس کے نتیجے میں ابحاث مزید توضیحات اور تشریحات کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان عزیزوں کے تشکر کے ساتھ امید ہے عنایات پروردگار سے اس شرح وتفسیر کا مناسب اثر عالم اسلام ومسلمین میں پیدا ہوگا اور یوم آخرت کا ذخیرہ قرار پائے گا۔

ناصر مکارم شیرازی

۱۳ رجب ۱۴۲۰ھ

حوزۂ علمیہ، قم

سیّد رضیؒ مدوّنِ نہج البلاغہ

تمام مورّخین کے نزدیک سیّد رضیؒ ۳۵۹ ہجری قمری میں بغداد میں پیدا ہوئے۔ بچے کا نام محمد رکھا، بعد میں ''شریف رضیؒ'' اور ''ذوالحسبین'' مشہور ہوئے۔ آپ کی والدہ فاطمہ بنت حسین ابن ابی محمد اطروش تھیں۔ حضرت امام علی علیہ السلام کی نسل سے تھیں۔[۱] آپ باکردار، بلند نظر خاتون تھیں۔ سیّد رضیؒ آپ کے بارے میں فرماتے ہیں:

لَوْ كَانَ مِثْلَكِ كُلُّ أُمِّ بَرَّةٍ غَنِيَ الْبَنُوْنَ بِهَا عَنِ الْآبَاءِ[۲]

اگر ساری مائیں آپ جیسی نیک ہوتیں تو بچّے باپ کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔[۳]

آپ کے والد حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی اولاد سے ہیں، جن کا نام ابواحمد، حسین بن موسیٰ ہے۔ آپ عباسی اور آلِ بویہ حکمرانوں کے نزدیک عظیم مقام رکھتے تھے۔ آپ کو ابونصر بہاء الدین نے ''الطاہر الاوحد'' کا لقب دیا۔ ابواحمد پانچ مرتبہ طالبیین کے سرپرست و رئیس رہے۔ جب آپ کی وفات ہوئی تو یہ گروہ آپ کو نقیب و بزرگ کے عنوان سے یاد کرتا تھا۔ سیّد رضیؒ ایسے ماں باپ کے ہاں پیدا ہوئے اور آپ نے پاک خاندان میں پرورش پائی، بچپن ہی سے آپ کے چہرے سے بزرگی کے آثار نمایاں تھے۔

مرحوم علامہ امینیؒ، سیّد رضیؒ کے بارے میں فرماتے ہیں: ''سیّد رضیؒ کا تعلق خاندان نبوت کے ان صاحبان افتخار افراد سے ہے، جن پر علم و دانش اور حدیث و ادب کے لحاظ سے دین و مذہب کو فخر ہے۔'' انہوں نے تمام نیک افراد کی نیکیاں میراث میں پائی ہیں جبکہ عظیم دانشور، بہترین زندگی کے مالک اور صائب و ثاقب نظر، بلند طبع، بہترین ادیب، پاکیزہ حسب کے مالک تھے۔

خاندانِ نبویؐ سے تعلق رکھتے تھے کہ ان کی عظمت حضرتِ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا سے تھی اور بزرگی و سیادت حضرت

---

[۱] فاطمہ بنت الحسین بن ابی محمد الحسن الاطروش بن علی بن الحسن بن علی بن عمر بن علی بن ابی طالب علیہم السلام۔

[۲] مقدّمۂ یادنامہ، علّامہ شریف رضیؒ۔

[۳] ابواحمد الحسین بن موسیٰ بن محمد بن موسیٰ بن ابراہیم بن الامام ابی ابراہیم موسیٰ الکاظمؑ۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے میراث میں ملی، سیّد رضیؒ کئی ایسے دیگر فضائل کے مالک ہیں کہ قلم ان کو بیان کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ [1]

علّامہ امینیؒ چالیس سے زیادہ ایسی کتابوں کا ذکر کرتے ہیں، جن میں سیّد رضیؒ کی زندگی اور شخصیت کے بارے میں تحریریں موجود ہیں اور مزید فرماتے ہیں: ''ان کی عظمت بلندی، علّامہ شیخ عبد الحسین حلّیؒ نے مقدمے کے طور پر تفسیر کی پانچویں جلد میں، ص ۱۱۲ پر بیان کی ہے۔ اسی طرح ان کی بلند شخصیت'' عبقریۃ الرضیؒ میں بیان کی گئی ہے، جو معروف مصنّف ''زکی مبارک'' نے دو جلدوں میں پیش کی ہے۔ ان دو افراد سے قبل علّامہ شیخ محمد حسین کاشف الغطاءؒ نے ان کے بارے میں کتاب لکھی ہے۔

سیّد رضیؒ کے اساتذہ

علامہ امینیؒ چودہ افراد کے نام بطور استاد سیّد رضیؒ ذکر کرتے ہیں، چنانچہ چند کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔ ابوسعید حسن بن عبد اللہ بن مرزبان نحوی، المعروف بہ سیرافی (متوفی ۳۶۸ھ) اُس وقت سیّد رضیؒ دس سال کے بھی نہیں تھے، جب ان کے پاس علم نحو سیکھا۔

۲۔ ابوعلی حسن ابن احمد فارسی، جو کہ نحوی معروف تھے، (متوفی ۳۷۷ھ)

۳۔ ہاون ابن موسیٰ۔

۴۔ ابویحییٰ عبد الرحیم بن محمد جو کہ ''ابنِ نباتہ'' مشہور تھے، اور زبردست خطیب تھے۔ (متوفی ۳۹۴ھ)

۵۔ قاضی عبد الجبار، شافعی معتزلی مشہور عالم تھے۔

۶۔ سیّد رضیؒ کے اصل اُستاد فقیہ، محدّث، متکلم اور شیعہ عظیم شخصیت شیخ مفیدؒ ہیں۔ یہاں سیّد رضیؒ اور سیّد مرتضیٰؒ کی شاگردی کی داستان قابل ذکر ہے

''الدّرجات الرفیعه'' کے مؤلف کہتے ہیں: شیخ مفیدؒ نے خواب دیکھا کہ حضرتِ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اپنے دونوں چھوٹے بچّوں کا ہاتھ پکڑے مسجد کرخ (جو بغداد کے قدیم محلے میں واقع ہے) میں تشریف لاتی ہیں، دونوں کو میرے حوالے کرتے ہوئے فرماتی ہیں میرے حسن و حسین علیہما السلام کو فقہ کی تعلیم دو۔

''وقالت له: علمهما الفقه'' شیخ مفیدؒ، حیرانی کے عالم میں بیدار ہوتے ہیں؛ معمول کے مطابق مسجد تشریف

---

[1] الغدیر، ج ۴، ص ۱۸۱

لے جاتے ہیں؛ کچھ دیر بعد محترمہ فاطمہ سیّد رضیؒ وسیّد مرتضیٰؒ کی والدہ اپنے بچّوں سیّد رضی، سیّد مرتضیٰؒ اور خادموں کے ساتھ مسجد میں تشریف لاتی ہیں؛ شیخ مفیدؒ ان کو دیکھ کر اپنی جگہ سے کھڑے ہوجاتے ہیں؛ فاطمہ کو سلام کرتے ہیں؛ فاطمہ شیخ مفیدؒ کی طرف دیکھ کر کہتی ہیں:

''اے شیخ! یہ دو میرے بچّے ہیں، ان کو آپ کے پاس لائی ہوں تا کہ علم فقہ کی تعلیم حاصل کریں۔''

شیخ مفیدؒ اپنے رات کے خواب میں محو ہوجاتے ہیں، رونے لگتے ہیں اور خواب بیان کرتے ہیں۔ اس طرح شیخ مفیدؒ نے ان دونوں بچّوں کی تعلیم وتربیت کی؛ خداوند عالم نے ان پر احسان کیا اور ان پر علم وفضل کے نئے باب کھولے اور آج بھی ان کے آثار باقی وموجود ہیں۔ اس واقعے کو ابن ابی الحدید نے اپنی شرح، جلد ۱، ص ۴۱ پر تحریر کیا ہے۔

سیّد رضیؒ کے شاگرد

بہت سے شیعہ وسنّی بزرگوں نے بیان کیا ہے کہ علامہ امینیؒ نے نو (۹) افراد کو ان کا شاگرد شمار کیا ہے، جنہوں نے سیّد رضیؒ سے روایت کی، ان میں سے آپ کے بھائی سیّد مرتضیٰ اور شیخ الطائفہ، ابوجعفر محمد بن حسن طوسیؒ ہیں۔ سیّد رضیؒ نے مدرسہ قائم کیا، جہاں طلاب، درس وتدریس کے ساتھ قیام بھی کرتے تھے اور اس کا نام ''دارالعلوم'' رکھا۔ سیّد رضیؒ وہ پہلے شخص ہیں، جنہوں نے اس طرح کا مدرسہ جہاں طلاب کی تعلیم کے ساتھ رہائش کا بھی مکمل انتظام ہو اور لائبریری بھی ہو، قائم کیا۔ [۱]

سیّد رضیؒ کی تالیفات

علّامہ امینی، سیّد رضیؒ کے آثار وتالیفات میں سے اُنیس کتابوں کا ذکر فرماتے ہیں، جن میں سے اہم ترین تالیف ''نہج البلاغہ'' ہے، جو مولائے کائناتؑ کے فرامین وخطوط پر مشتمل ہے۔ علّامہ امینیؒ اُن اکیاسی (۸۱) کتابوں کا ذکر کرتے ہیں، جو ان کے دورِ حیات تک نہج البلاغہ کی شرح کے عنوان سے لکھی جا چکی تھیں۔

سیّد رضیؒ کی تالیفات میں سے اہم ترین کتب درج ذیل ہیں

۱۔ خصائص الائمہؑ: جس کی طرف مؤلف نے نہج البلاغہ کے مقدمے میں اشارہ کیا ہے۔

۲۔ مجازات آثار النبویہؐ: جو ۱۳۲۸ ہجری میں بغداد سے طبع ہوئی۔

---

[۱] یادنامہ علامہ سید رضیؒ، ص ۲۹

۳۔علمی خطوط (تین جلدوں پر مشتمل ہے)

۴۔معانی القرآن

۵۔حقائق التاویل فی متشابہ التنزیل (جسے ''کشّی'' نے حقائق التنزیل سے تعبیر کیا ہے)

مرحوم شیخ عباس قمیؒ اپنے استاد محدث نوریؒ سے نقل فرماتے ہیں اور ابوالحسن عمری بھی اس بات کے قائل ہیں کہ ''حقائق التنزیل'' شیخ طوسیؒ کی کتاب ''تبیان'' سے بھی زیادہ بڑی، مفید اور جامع ہے، ہمیں اس کتاب کی پانچویں جلد ملی، جس میں سورۂ آلِ عمران کی ابتدا سے لے کر سورۂ نساء کے وسط تک (قرآن کی) تفسیر ہے۔اس کتاب میں سیّد رضیؒ کی قابل قدر روش یہ رہی ہے کہ ایک مشکل آیت کو بیان کرتے ہیں اور اس میں موجود پیچیدگیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان اشکالات کا مفصل جواب دیتے ہیں اور اسی ضمن میں دیگر آیات کی بھی تفسیر کرتے ہیں۔لہٰذا انہوں نے تمام آیتوں کی تفسیر نہیں کی ہے بلکہ مشکل اور مبہم آیتوں کی تفسیر لکھی ہے۔[1]

سیّد رضیؒ اور شعر

سیّد رضیؒ شعر گوئی میں بھی مشہور تھے، لیکن شعر گوئی نے ان کی عظمت میں اضافہ نہیں کیا، بلکہ وہ خود پہلے ہی عظیم تھے، سیّد رضیؒ ابھی دس سال کے بھی نہیں ہوئے تھے، کہ ''قصیدۂ غرّاء'' لکھا، جس میں انھوں نے اپنا نسب عالی بیان کیا۔ بہت سے دانشمندوں نے آپ کو قریش کا بہترین شاعر کہا ہے، خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے، محمد بن عبداللہ کاتب سے سنا ہے، ایک بزرگ جن کا نام ابوالحسین بن محفوظ ہے، انہوں نے کہا، میں نے ادبیات کے ماہرین سے سنا کہ سیّد رضیؒ زبردست شاعر قریش تھے۔ابن محفوظ نے جواب دیا، یہ صحیح ہے کہ قریش میں اچھے شاعر جو اچھے شعر کہتے تھے بہت تھے، مگر وہ کم کہتے تھے لیکن ایسے شاعر جو زیادہ اور اچھے شعر کہتے ہوں، سیّد رضیؒ کے علاوہ کوئی اور نہیں۔

سیّد رضیؒ کے القاب اور ان کی سماجی شخصیّت

بہاء الدولہ دیلمی نے ۳۸۸ھ میں سیّد رضیؒ کو ''شریفِ اجل'' کا لقب دیا۔ ۳۹۲ھ میں ''ذوالمنقبتین'' کا ۳۹۸ھ میں ''رضی ذوالحسبین'' کا لقب ملا۔ ۴۰۱ھ میں بہاء الدّولہ نے حکم دیا کہ تمام تقاریر اور مکاتیب میں سیّد رضیؒ کو ''شریف

---

[1] سفینۃ البحار، مادّہ ''رضا''

اجل'' کے لقب سے یاد کیا جائے۔

سیّدرضیؒ کو ۳۸۰ھ میں جب آپ کی عمر مبارک ۲۱ سال سے زیادہ نہ تھی، عباسی خلیفہ ''الطائع باللہ'' کی جانب سے ''طالبیین'' کی سرداری، حاجیوں کی سرپرستی، دیوان مظالم کی ذمہ داری جیسے عہدوں سے نوازا گیا۔ ۱۶ محرّم ۴۰۳ھ میں تمام شہروں میں موجود ساداتِ کرام کے ولی اور سرپرست منصوب ہوئے، اور نَقِیبُ النُّقَبَاءِ[1] کہلائے جانے لگے۔

سیّدرضیؒ نے اپنی تمام تر ذمہ داریوں کو خوب نبھایا، یہاں تک کہ خلیفہ عبّاسی القادر باللہ کے زمانے میں خادم حرمین شریفین قرار پائے۔ اگرچہ یہ بات بہت واضح ہے کہ سیّدرضیؒ کو یہ ذمہ داریاں اور اعلیٰ مناصب سونپنے کا اہم سبب جناب سیّدرضیؒ کا بنی ہاشم، سادات اور علویوں میں خاص اہمیت کا حامل ہونا تھا، چنانچہ عباسی خلفاء کے نزدیک سوائے اس کے کہ وہ سیّدرضیؒ ہی کی طرح کے لوگوں کو یہ منصب دیں، کوئی اور چارۂ کار نہیں تھا۔

سیّدرضیؒ کے متعلق دانشوروں کے اقوال

بہت سے دانشوروں نے سیّدرضیؒ کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے، لیکن ہم چند افراد کے اقوال نقل کرتے ہیں:

۱۔ ثعلبی جو آپ کے ہم عصر تھے، کہتے ہیں: سیّدرضیؒ آج کے زمانے کے روشن فکر اور شریف ترین عراقی سیّد ہیں، وہ حسب ونسب کے لحاظ سے اصیل اور ان کی شرافت، ادب وفضل آشکار ہے۔

۲۔ ابن جوزی نے ''المنتظم'' میں لکھا: سیّدرضیؒ بغداد کے طالبیین کے بڑوں میں سے تھے۔ جب آپ کی عمر تین سال تھی کہ آپ نے بہت جلد قرآن حفظ کیا، اور فقہ کو بہت جلد مکمل کیا، آپ دانشمند، فاضل، زبردست شاعر، بلند ہمت اور دین دار تھے۔ بیان کیا جاتا ہے ایک دن آپ نے ریشمی کپڑا ایک عورت سے پانچ درہم میں خریدا، جب گھر لے جا کر اسے کھولا تو اس میں ابنِ علی بن مقلہ کا لکھا ہوا کاغذ پایا؛ سیّدرضیؒ نے خادم سے کہا، اس عورت کو بلاؤ؛ جب عورت آئی تو اس سے کہا، میں نے تم سے جو کپڑا خریدا تھا اس میں ابن علی بن مقلہ کے ہاتھوں کی تحریر ہے، اب تمہاری مرضی ہے اس کاغذ کو لے لو یا اس کی

---

[1] نقابت، وہ منصب تھا جو ممتاز ومحبوب عالم باتقویٰ کو دیا جاتا تھا۔ لوگ اُسکی طرف رجوع کرتے تھے، منصب ھٰذا کا مالک درج ذیل امور کو انجام دیتا تھا اور اسے خلیفہ وقت کی تائید حاصل ہوتی تھی۔

۱۔ سادات گھرانوں کی حفاظت و پرورش ۲۔ اَخلاقی و ادبی لحاظ سے لوگوں کی پرورش ۳۔ لوگوں کو پست مشغلوں اور غیر مشروع کاموں سے دور رکھنا ۴۔ شریعتِ محمدیؐ کی بے حرمتی سے روکنا ۵۔ دوسروں پر ظلم کرنے سے روکنا ۶۔ حقوق کی حفاظت وادائیگی ۷۔ بیت المال سے لوگوں کے حقوق طلب کرنا ۸۔ خواتین اور ان کی بیٹیوں کی شادیوں کی نگرانی کرنا ۹۔ عدالت کا قیام ۱۰۔ موقوفات پر نظارت رکھنا (الغدیر ج ۴، ص ۲۰۵ تا ۲۰۷، خلاصے کے ساتھ)

قیمت مجھ سے وصول کرلو؛ عورت نے پیسے لے کر سیّد رضیؒ کے لیے دُعا کی اور چلی گئی۔ سیّد رضیؒ کی سخاوت مندانہ زندگی میں اس طرح کے منفرد واقعات بہت زیادہ ہیں۔

۳۔ معاصرین میں سے مصر کے مشہور دانشمند ''ڈاکٹر زکی مبارک'' جو خود بہترین مصنّف بھی ہے، لکھتے ہیں: ''بلاشبہ سیّد رضیؒ ایک عظیم مصنّف ہیں، لیکن ان کی روِش، علمی روِش ہے، فنی روش نہیں۔ اگرچہ بعض جگہ فنی روِش نظر آتی ہے۔

دوسرے مقام پر کہتے ہیں:

''جب سیّد رضیؒ کے شعر سننے کے بعد ان کی نثر اور دوسری تحریروں پر نظر ڈالتے ہیں تو لگتا ہے کہ سیّد رضیؒ ایک اور شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ ایسے دانشمند ہیں، جن کی تحریر گواہی دیتی ہے کہ قابلِ فخر ادیبوں میں سے ایک ہیں، ایسا دانشور جو لغت اور شریعت سے متعلق علوم پر لکھتا ہے تو ادبیات کی بہترین خوشبو چھوڑ جاتا ہے۔''

وہ ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

''اگر سیّد رضیؒ کے تمام آثارِ قلمی محفوظ رہ جاتے تو اس وقت ہم کہہ سکتے تھے کہ وہ تمام مولفوں اور مصنفوں میں یگانہ روزگار اور ایسے عظیم مؤلف ہیں جن کی مثال نہیں۔''[۱]

سیّد رضیؒ کی وفات

سیّد رضیؒ ۶ محرّم ۴۰۶ھ ہجری میں (۴۷ سال کی عمر میں) اس دار فانی کو الوداع کہہ گئے۔ آپ کی وفات کی خبر سن کر وزراء، قضات اور دوسری اہم شخصیات اور ہر طبقے کے افراد ننگے پاؤں ان کے گھر کی طرف روانہ تھے۔ آپ کا گھر محلہ کرخ میں تھا، جہاں بے مثال مراسم ادا ہوئے۔ بہت سے مورّخوں کے مطابق آپ کے جسد کو کربلا منتقل کیا گیا۔ آپ کو آپ کے والد کے برابر میں سپردِ خاک کیا گیا۔ جو چیز تاریخ سے ملتی ہے، وہ یہ ہے کہ آپ کی قبر حضرت امام حسین علیہ السلام کے حرم میں ہے۔ سیّد مرتضیٰ، سیّد رضیؒ کے بھائی، شدتِ غم کی وجہ سے جنازے میں شریک نہیں ہوئے اور انھوں نے نماز جنازہ ادا نہیں کی، اور بھائی کا آخری دیدار بھی کرنے کی تاب نہیں رکھتے تھے اور اسی غم میں امام موسیٰ کاظمؑ کے حرم یعنی قبرِ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے قریب مدت تک بیٹھے رہے۔ بہت سے شعرائے کرام من جملہ سیّد مرتضیٰؒ نے آپ کی وفات پر مرثیے کہے۔[۲]

---

[۱] عبقریہ الشریف الرضیؒ ص ۲۰۴، ۲۰۵

[۲] سیّد رضیؒ کی زندگی کے بارے میں الغدیر ج ۴، ص ۱۸۱ تا ۲۱۱، شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، عبقریہ الشریف الرضیؒ، سفینۃ البحار اور یادنامہ علّامہ شریف رضیؒ دیکھیے)

نہج البلاغہ اور اُس کے خالق کے بارے میں

حضرت علی علیہ السلام یا نہج البلاغہ کے بارے میں [1] گفتگو کرنا ایک اعتبار سے آسان کام نہیں، جبکہ ایک اور اعتبار سے آسان ہے، جو چاہتے ہیں مولا علی علیہ السلام کی زندگی کو گہرائی سے دیکھیں، ان کے لیے یہ کام آسان نہیں کہ وہ ان کی بلند فکری، قوتِ ایمانی اور ملکاتِ نفسانی سے آشنا ہوں، یا نہج البلاغہ کا حق ادا کرتے ہوئے اس کی شناخت کر سکیں، یہاں البتہ ان دو گہرے سمندروں کے ساحلوں سے آگاہی حاصل کرنا سب کے لیے ممکن ہے۔ جو تھوڑی سی بھی معلومات حضرت علی علیہ السلام اور اُن کی زندگی کے بارے میں ان کے اقوال و افکار کے بارے میں رکھتا ہو، بخوبی جانتا ہے کہ وہ ایک بلند انسان ہیں، وہ خدا کی نشانیوں میں سے بزرگ ترین نشانی ہیں۔ وہ انسان کے وجود کی کتاب کا نادر نسخہ اور عجوبہ روزگار شخصیت ہیں۔

نہج البلاغہ ایک ایسا سمندر ہے، جس کا کنارہ نہیں، بحرِ بے کراں ہے اور جواہرات سے پُر گنجینہ ہے؛ ایسا باغ ہے جہاں پھول ہی پھول ہیں؛ ایسا آسمان ہے جہاں ستارے ہی ستارے ہیں، مختصراً یہ کہ ایسا شہر ہے جہاں انسانی سعادت کی تمام چیزیں موجود ہیں۔ بے شک جب کوئی اس میدان میں قدم رکھنے کا ارادہ کرے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ ایک ضخیم کتاب لکھنے کے لیے خود کو تیار کرے، جبکہ ہمارا مقصد صرف اشاروں سے کام لینا ہے اور مختصر طور پر امامؑ کے کلام کی شرح مطلوب ہے۔ اگرچہ امامؑ کا کلام خود اپنے کلام کا شارح ہے۔ یہ خود آفتاب بھی ہے اور دلیلِ آفتاب بھی۔ اس مقام پر چند موضوعات کی جانب توجّہ دلانا مقصود ہے۔ اسی طرح اور دوسرے دانشوروں کے افکار سے جو برسوں سے نہج البلاغہ اور اس کے خالق سے آشنا ہیں، استفادہ چاہتے ہیں۔ خصوصاً غیر مسلم اور غیر شیعہ افراد کے بیانات جنہوں نے امام علی علیہ السلام کے کلام کو سنا یا پڑھا اور امامؑ کے گرویدہ ہوئے تا کہ ہماری تحریر زیادہ مؤثر ہو سکے۔

خوشتر آن باشد کہ حسنِ دلبران
گفتہ آید در زبانِ دیگران

---

[1] اتفاقاً اس کام کا آغاز خدا کی عطا کردہ توفیق کے ذریعے ۱۳ رجب المرجب ۱۴۱۳ ہجری قمری شبِ ولادتِ امیر المومنین علیہ السلام ہوا۔

کلام مولا علیہ السلام کی تجلیاں

مطالعے کے دوران نہج البلاغہ کی تاریخ، شروح، تفاسیر کی طرف رجوع کیا تو اس نکتے کو پایا کہ بہت سے افراد حتیٰ کہ علماء اور دانشمندوں نے دُور سے نہج البلاغہ کے بارے میں سنا ہے اور تصوّر کیا کہ یہ کوئی عام سا کلام ہے، یا اس سے کچھ بلند ہے جو امام علیؑ کے اقوال، اُن کے ارشادات پر مبنی ہے، لیکن جب اس کے قریب ہوتے ہیں تو اپنے آپ کو ایک عظیم سمندر کے سامنے پاتے ہیں کہ جس کی گہرائی اس کے کنارے سے نظر نہیں آتی۔ ایسے میں ان پر حیرت چھا جاتی ہے اور ان سے ایسے کلمات اور احساسات کا اظہار ہوتا ہے جو شوق و عشق پر مبنی ہیں، جنھیں درج ذیل عناوین میں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ نہج البلاغہ کی فصاحت و بلاغت ۲۔ نہج البلاغہ کے عظیم و عمیق مطالب ۳۔ نہج البلاغہ کی بے مثال جاذبیت

نہج البلاغہ کی فصاحت و بلاغت

پہلے حصّے میں نہج البلاغہ کی فصاحت و بلاغت کے بارے میں ادیبوں اور بزرگوں کے کلمات پر (جو انھوں نے نہج البلاغہ کے بارے میں کہے ہیں) نظر ڈالتے ہیں، جن سے پتا چلتا ہے کہ وہ نہج البلاغہ کے حُسن و زیبائی، شیریں تعبیرات، فن فصاحت و بلاغت کی کرشمہ سازیوں سے متاثر ہو کر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں، جو کہ اس کتاب کے حُسن میں مزید اضافہ کا باعث ہیں

۱۔ سب سے پہلے نہج البلاغہ کے جمع کرنے والے کے بارے میں غور کرتے ہیں جو خود میدانِ فصاحت و بلاغت کے بے نظیر مرد ہیں اور جنھوں نے اپنی عمرِ مبارک نہج البلاغہ کی جمع آوری میں لگا دی کہ ''ڈاکٹر زکی مبارک'' مصر کے معروف قلمکار ''عبقریۃ الشریف الرضیؒ'' میں لکھتے ہیں:

جب ان کی نثر کو دیکھتے ہیں تو نثر خود گواہی دیتی ہے کہ وہ ادباء میں سے ہیں اور جب ان کے اشعار پر نظر ڈالتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے ایک بلند پایہ اور باذوق شاعر ہیں، جبکہ بہت کم دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک ہی شخص دونوں شعبوں میں مہارت رکھتا ہو۔ نہایت افسوس ہے کہ ان کے تمام آثار ہماری دسترس میں نہیں، اگر ہوتے تو کہہ سکتے تھے کہ وہ مؤلفوں کی صف میں

اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔ [1]

سیّد شریف رضیؒ نہج البلاغہ کے مقدمے میں فرماتے ہیں:

"كَانَ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَشْرَعَ الْفَصَاحَةِ وَ مَوْرِدَهَا وَ مَنْشَأَ الْبَلَاغَةِ وَ مَوْلِدَهَا وَ مِنْهُ ظَهَرَ مَكْنُوْنُهَا وَ عَنْهُ اُخِذَتْ قَوَانِيْنُهَا وَ عَلٰى أَمْثِلَتِهِ حَذَا كُلُّ قَائِلٍ خَطِيْبٍ وَ بِكَلَامِهِ اسْتَعَانَ كُلُّ وَاعِظٍ بَلِيْغٍ وَ مَعَ ذٰلِكَ فَقَدْ سَبَقَ وَ قَصَّرُوا وَقَدْ تَقَدَّمَ وَتَأَخَّرُوْا"

''امیر المومنینؑ سرچشمۂ فصاحت ہیں اور بلاغت نے آپ سے نشاط پائی ہے۔ آپؑ سے اسرارِ بلاغت آشکار ہوئے۔ قوانین و دستورِ بلاغت آپ سے حاصل کیے گئے۔ آپؑ کی طرز سے ہر خطیب نے طاقت پائی۔ آپؑ کے کلام سے ہر خطیب، توانا خطیب بنا، اور وہ میدانِ خطابت میں ایسے آگے بڑھا کہ دوسروں کو پیچھے چھوڑ دیا۔''

پھر نہج البلاغہ کے بارے میں مزید بیان کرتے ہیں:

"لِاَنَّ كَلَامَهُ (عَلَيْهِ السَّلَامُ) اَلْكَلَامُ الَّذِيْ عَلَيْهِ مَسْحَةٌ مِنَ الْعِلْمِ الْإِلٰهِيِّ وَ فِيْهِ عَبْقَةٌ مِنَ الْكَلَامِ النَّبَوِيِّ"

''امیر المومنینؑ کا کلام علم الٰہی کی نشانی اور رسولِ اکرمؐ کے کلام کی خوشبو رکھتا ہے۔''

۲۔ اس کے بعد بہت سے شارحین نہج البلاغہ میں سے ایک جنہوں نے ایک مدت نہج البلاغہ کی شرح و تفسیر میں لگائی اور جو نہج البلاغہ کے بارے میں کافی آگاہی رکھتے ہیں اور اس کی گہرائی اور دقائق سے آشنا ہیں، اہلِ سنّت کے مشہور علماء میں سے ہیں اور ساتویں صدی ہجری کی شخصیت یعنی عزالدین عبدالحمید ابن ابی الحدید معتزلی نے نہج البلاغہ کی شرح کے دوران بار بار اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہ فصاحت و بلاغت کی اس منزلت پر ہیں کہ یہاں سرِ تسلیم خم ہو جاتا ہے۔ [2] وہ ایک جگہ خطبہ ۲۲۱ کے ذیل میں مولا علیؑ کے کلام کی شرح کے بعد برزخ کے بارے میں کہتے ہیں:

"وَ يَنْبَغِيْ لَوِ اجْتَمَعَ فُصَحَاءُ الْعَرَبِ قَاطِبَةً فِيْ مَجْلِسٍ وَ تُلِيَ عَلَيْهِمْ اَنْ يَسْجُدُوْا لَهُ كَمَا سَجَدَ الشُّعَرَاءُ لِقَوْلِ عَدِيِّ ابْنِ الرُّقَاعِ: قَلَمَ أَصَابَ مِنَ الدَّوَاةِ مِدَادَهَا... فَلَمَّا قِيْلَ لَهُمْ فِيْ ذٰلِكَ قَالُوْا إِنَّا نَعْرِفُ مَوَاضِعَ السُّجُوْدِ فِي الشِّعْرِ كَمَا تَعْرِفُوْنَ مَوَاضِعَ السُّجُوْدِ فِي الْقُرْآنِ"

''اگر عرب کے تمام فصحاء کو ایک جگہ جمع کر کے خطبے کے اس حصّے کو ان کے سامنے پڑھا جائے، تو حق یہ ہے کہ تمام

---

[1] کتاب عبقریۃ الشریف الرضیؒ، ص ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۹ (خلاصہ)

[2] یہ کتاب ۲۰ جلدوں پر مشتمل ہے، جو امیر المومنینؑ کے دورِ خلافت کے برابر تقریباً پانچ سال میں مکمل ہوئی۔

کے تمام اس کے لیے سجدے میں گر جائیں کہ عرب کے معروف شاعر ''عدی بن الرقاع'' کے اس شعر کو سن کر ادیبوں نے اس کے لیے سجدہ کیا اور جب ان سے سوال کیا کہ سجدے کی کیا وجہ تھی؟ تو جواب دیا ہم جانتے ہیں کہ کس شعر پر سجدہ کیا جائے، جس طرح تم جانتے ہو کہ آیاتِ سجدہ کون سی ہیں۔''[۱]

ایک مقام پر حضرت امام علی علیہ السلام کے کلام کا موازنہ چوتھی ہجری کے مشہور خطیب ''ابنِ نباتہ''[۲] سے کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''فَلْيَتَأَمَّلْ أَهْلُ الْمَعْرِفَةِ بِعِلْمِ الْفَصَاحَةِ وَ الْبَيَانِ هَذَا الْكَلَامَ بِعَيْنِ الإِنْصَافِ يَعْلَمُوا أَنَّ سَطْراً وَاحِداً مِنْ كَلَامِ نَهْجِ الْبَلَاغَةِ يُسَاوِي أَلْفَ سَطْرٍ مِنْهُ بَلْ يَزِيدُ وَ يُرْبِي عَلَى ذٰلِكَ''

''علم فصاحت و بلاغت سے واقف لوگ اگر حضرت علی علیہ السلام کے کلام کو انصاف کی نگاہ سے دیکھیں، تو نہج البلاغہ کی ایک سطر، ابنِ نباتہ کی ہزار سطروں کے برابر ہے، بلکہ ان پر برتری رکھتی ہے۔''[۳]

اس مقام پر ایک اور عجیب تعبیر موجود ہے، جہاں ابن نباتہ کے ایک خطبے میں (جو جہاد کے بارے میں ہے اور جسے فصاحت و بلاغت کا کمال تصور کیا جاتا ہے) حضرتؑ کا ایک جملہ شامل کیا گیا ہے:

''مَا غُزِيَ قَوْمٌ فِي عُقْرِ دَارِهِمْ إِلَّا ذَلُّوا''

''کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس پر ان کے گھروں میں حملہ ہوا اور وہ ذلیل و خوار نہ ہوئی ہو۔''

علم فصاحت و بلاغت کے ماہر اگر حضرتؑ کا یہ جملہ انصاف کی نگاہوں سے دیکھیں تو حضرتؑ کی ایک سطر ابن نباتہ جیسے معروف خطیب کی ہزار سطروں پر بھاری ہے اور یہاں ابن ابی الحدید کہتے ہیں، اس ایک جملے کو دیکھا جائے تو فصاحت و بلاغت جاننے والے خود بولیں گے کہ یہ ایک جملہ اس خطبے کا نہیں ہے، جیسے کسی خطبے یا تحریر میں قرآن کی آیت کو لکھا جاتا ہے تو وہ پورے کلام میں منفرد ہوتی ہے۔[۴]

ابن ابی الحدید معتزلی کے ان کلمات پر گفتگو کو ختم کرتے ہیں، جو انھوں نے کتاب کے مقدمے میں بیان کیے ہیں:

''وَ أَمَّا الْفَصَاحَةُ فَهُوَ (عَلَيْهِ السَّلَامُ) إِمَامُ الْفُصَحَاءِ وَ سَيِّدُ الْبُلَغَاءِ وَ فِي كَلَامِهِ قِيلَ: دُونَ كَلَامِ الْخَالِقِ وَ فَوْقَ كَلَامِ الْمَخْلُوقِينَ وَ مِنْهُ تَعَلَّمَ النَّاسُ الْخِطَابَةَ وَ الْكِتَابَةَ''

---

[۱] شرح نہج البلاغہ ابنِ ابی الحدید جلد ۱۱ صفحہ ۱۵۳

[۲] اس کا نام ابو یحییٰ عبد الرحیم بن محمد بن اسماعیل بن نباتہ ہے جس نے سن ۳۷۴ھ ق میں وفات پائی۔

[۳] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد ۷ صفحہ ۲۱۴

[۴] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد ۲، صفحہ ۸۴

''رہی فصاحت تو حضرت امیر المومنینؑ فصحاء کے رہبر اور بلغاء کے سردار ہیں؛ اُن کے کلام کے بارے میں کہا گیا ہے کہ خدا کے کلام سے نیچے اور مخلوق کے کلام سے بالا آپؑ کا کلام ہے؛ لوگوں نے آپؑ سے خطابت اور تحریر کا ہنر سیکھا ہے۔[۱]

۳۔ جارج جرداق، لبنان کا مشہور عیسائی قلمکار اپنی بیش بہا کتاب ''الامام علیؑ صوت العدالۃ الانسانیۃ'' کی آخری فصل میں حضرت علیؑ کی شخصیت کے بارے میں لکھتا ہے: بلاغت میں سب سے اونچا مقام آپ کی بلاغت کا ہے، گویا قرآن ہے جو اپنے مقام سے کچھ نیچے آ گیا ہے۔ آپ کا کلام عربی زبان کی تمام گزشتہ اور آئندہ خوبصورتیوں کو سمیٹے ہوئے ہے اور اُس کے لکھنے والے یعنی حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں لکھتا ہے، ''خدا کے کلام سے نیچے اور مخلوق کے کلام سے بلند آپ کا کلام ہے۔''[۲]

۴۔ جاحظ جو علماء و نوابغ عرب میں شمار ہوتے ہیں اور جنہوں نے تیسری صدی ہجری کے اوائل میں زندگی گزاری، اپنی معروف کتاب ''البیان والتبین'' میں امیر المومنینؑ کے کلماتِ قصار نقل کرتے ہوئے اُن کی مدح کرتے ہیں۔ اپنی کتاب کی پہلی جلد میں امامؑ کے اس کلمے کو بیان کرتے ہیں "قِيمَةُ كُلِّ امْرِءٍ مَا يُحْسِنُهُ" انسان کی قیمت وہ (ہنر) ہے، جسے وہ اچھی طرح جانتا ہے اور کر سکتا ہے۔[۳]

وہ لکھتا ہے اگر پوری کتاب میں صرف یہ ہی جملہ ہوتا تو کافی تھا، بلکہ اس سے زیادہ کفایت کرتا ہے۔ بہترین کلام وہ ہے جو مختصر ہو اور مفید ہو اور اس کا مفہوم روشن ہو۔ گویا خداوند عالم نے اس کلام کو جلالت و عظمت کا لباس پہنایا ہے اور اسے نورِ حکمت عطا کیا ہے۔ جو پاک نیت و صاحب تقویٰ کہنے والے (علیؑ) کی طرح بے نظیر ہے۔

۵۔ ''الطراز'' کا مولف ''امیر یحییٰ علوی'' اپنی کتاب میں جاحظ کا یہ جملہ نقل کرتے ہوئے کہ ''یہ مردِ میدان، فصاحت و بلاغت کا بے مثال شخص ہے، مزید اِس طرح بیان کرتے ہیں۔ خدا اور رسولؐ کے بعد کوئی کلام میرے کانوں نے نہیں سنا جو بے مثل ہو، سوائے امیر المومنین کرم اللہ وجہہٗ کے کلام کے۔ میں نے ان کے کلام کا دیگر کلاموں سے موازنہ کیا مگر کسی کو ان کے کلام کے مقابل نہیں پایا، مثلاً یہ جملے

"مَا هَلَكَ امْرُءٌ عَرَفَ قَدْرَهُ"

''جو اپنی قدر جانتا ہو، کبھی ہلاک نہیں ہوگا۔''

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ عَرَفَ رَبَّهُ"

---

[۱] شرح نہج البلاغہ جلد ۱ صفحہ ۲۴

[۲] صوت العدالۃ الانسانیۃ، ج ۱، صفحہ ۴۷

[۳] نہج البلاغہ، قصار الحکم، شمارہ ۸۱

''جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا، اُس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔''

"اَلْمَرْءُ عَدُوُّ مَا جَهِلَ"

''انسان اُس چیز کا دشمن ہے جسے نہیں جانتا۔''

"وَ اسْتَغْنِ عَمَّنْ شِئْتَ تَكُنْ نَظِيْرَهُ"

''جس کا نظیر بننا چاہتے ہو اس سے بے نیاز رہو۔''

"وَ اَحْسِنْ اِلٰى مَنْ شِئْتَ تَكُنْ اَمِيْرَهُ"

''اور جس کا امیر بننا چاہتے ہو اس کے ساتھ نیکی کرو۔''

"وَ احْتَجْ اِلٰى مَنْ شِئْتَ تَكُنْ اَسِيْرَهُ"

''اور جس کسی کا نیاز مند رہنا چاہتے ہو رہو، تم اس کے اسیر بن جاؤ گے۔''

پھر مزید لکھتا ہے کہ جاحظ اگر انصاف سے پڑھے تو اسے ماننا پڑے گا کہ حضرت علی علیہ السلام نے اس کے کانوں کے پردے ہلا دیے ہیں اور فصاحت و بلاغت کے معجزے سے اس کی عقل حیران کر دی ہے اور جب جاحظ جیسا زبردست ادیب علیؑ کے سامنے ایسا ہو تو پھر دوسروں کا حال تو واضح ہے کہ کیا ہوگا۔ [۱]

یہ ایک حقیقت ہے کہ یہی زیدی دانشمند (صاحبِ کتاب الطراز) اس بات پر حیرت کا اظہار کرتا ہے کہ بزرگ علمائے علمِ معانی و بیان خدا اور رسولؐ کے کلام کے بعد علیؑ کے کلام کو نظر انداز کرتے ہوئے شعرائے عرب اور خطبائے عرب کے دیوانوں اور آثار پر بھروسا کرنے لگے، جبکہ جانتے ہیں کہ فصاحت و بلاغت کی بلند ترین کیفیت کہ جس میں جو چاہیں میسر ہے، استعارہ، کنایہ، تمثیل خوبصورت مجاز اور گہرے مفاہیم سب اس نہج البلاغہ میں موجود ہیں۔ [۲]

۶۔ محمد غزالی نظرات فی القران کے مشہور مصنّف اپنے فرزند کو نصیحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اِذَا شِئْتَ اَنْ تَفُوْقَ اَقْرَانَكَ فِي الْعِلْمِ وَ الْاَدَبِ وَ صَنَاعَةِ الْاِنْشَاءِ فَعَلَيْكَ بِحِفْظِ الْقُرْآنِ وَ نَهْجِ الْبَلَاغَةِ" [۳]

''اگر چاہتے ہو علم و ادب میں برتر ہو تو قرآن اور نہج البلاغہ کو حفظ کرو۔''

---

[۱] الطراز، ج۱، ص ۱۶۵، ۱۶۸

[۲] الطراز، ج۱، ص ۱۶۵، ۱۶۸

[۳] نظرات فی القرآن، ص ۱۵۴، از نقل نہج البلاغہ، ج۱، ص ۹۱

۷۔ مفسرِ قرآن شہاب الدین آلوسی جب نہج البلاغہ کے نام پر پہنچے تو کہتے ہیں:

''اس کتاب کا نام اس لیے نہج البلاغہ ہے کہ یہ اُس کے کلام پر مشتمل ہے جس کے بارے میں انسان تصوّر کرتا ہے، یہ کلامِ مخلوق سے بلند اور کلامِ خالق سے نیچے ہے۔ یہ کلام معجز نما ہے، حقیقت و مجاز ہے رمز و استعارات سے بھرا ہے۔ [۱]

۸۔ اُستاد محمد محی الدین عبدالحمید، نہج البلاغہ کی توصیف میں لکھتے ہیں:

یہ ایسی کتاب ہے جو اپنے اندر سے فصاحت و بلاغت و فنون کے چشمے جاری کر رہی ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ اس پھل ''نہج البلاغہ'' کی شیرینی اور لذت سے استفادہ کیا جائے۔ یہ اُس کا کلام ہے جو مخلوقِ خدا میں بعد از رسولؐ سب سے بہتر ہے۔ جس کا لغات اور منطق پر مکمل تسلط ہو کہ جیسے چاہیں الفاظ کو استعمال کر لیں۔ ایسے حکیم ہیں کہ ان کے فنونِ حکمت بیان سے باہر ہیں۔ ایسے خطیب ہیں کہ سحر بیان دلوں کو ہلا کر رکھ دیں اور ایسے عالم اور دانشور ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہم نشینی، کتابتِ وحی، تلوار و زبان سے دین کا دفاع کیا، بچپن سے جوانی اور پھر بڑھاپے تک آپ کی خدمات نے آپ میں ایسی صلاحیت ایجاد کر دی جو کسی اور میں نہیں ہو سکتی۔ [۲]

۹۔ اہلِ سنّت کے بزرگ عالم، شارحِ نہج البلاغہ شیخ محمد عبدہٗ اپنی کتاب کے مقدمے میں اعتراف کرنے کے بعد کہ اتفاقاً ''نہج البلاغہ'' سے آشنائی ہوئی، فرماتے ہیں کہ یہ بات سوچنے کی ہے کہ ''جب نہج البلاغہ کے بعض صفحات پر نظر ڈالی، بعض عبارات پر غور کیا، اس کے مختلف عناوین پر توجّہ کی تو ایسا لگا، گویا اس کتاب میں جنگیں برپا ہیں، مگر ان پر فصاحت کی حکومت اور بلاغت کا اختیار ہے اور وہم و خیالاتِ باطل پر سپاہِ خطابت نے حملہ کر دیا ہے اور توہمّات کے لشکر پر فصاحت و بلاغت نے فتح حاصل کر لی ہے۔ [۳] بنا بر نقل اور مضبوط اور قوی دلائل نے وسوسوں پر حملہ کر کے انھیں شکست دے دی ہے، اور جو قدرتِ باطل کو ہر جگہ ختم کر رہا ہے، شک و تردّد کو شکست دے رہا ہے، اوہام کے فتنوں کو مٹا رہا ہے، وہ حاکم اور دلاور امیر المومنین علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام ہیں۔

۱۰۔ سبط ابنِ جوزی جو خود مورّخ و مفسرِ اہلِ سنّت ہیں، ''تذکرۃ الخواص'' میں ایک جاذب جملہ لکھتے ہیں:

''وَ قَدْ جَمَعَ اللّٰهُ لَهُ بَيْنَ الْحَلَاوَةِ وَ الْمَلَاحَةِ و الطَّلَاوَةِ وَ الْفَصَاحَةِ لَمْ يَسْقُطْ مِنْهُ كَلِمَةٌ وَلَا بَارَتْ لَهُ حُجَّةٌ، اَعْجَزَ النَّاطِقِيْنَ وَ حَازَ قَصَبَ السَّبْقِ فِي السَّابِقِيْنَ اَلْفَاظٌ يُشْرِقُ عَلَيْهَا نُوْرُ النُّبُوَّةِ وَ

---

[۱] از کتاب الجدیرۃ الغیبیۃ نقل از مصادر، نہج البلاغہ ج ۱

[۲] مصادر نہج البلاغہ، جلد ۱، صفحہ ۹۶

[۳] شرح نہج البلاغہ محمد عبدہٗ، صفحہ ۹، ۱۰

یُحَیِّرُ الْاَفْهَامَ وَ الْاَلْبَابَ"۔ [۱]

''اللہ نے شیرینی و نمکینی وخوبصورتی اور فصاحت کی تمام خصوصیات حضرت علی علیہ السلام میں جمع کر دیں۔کوئی بات آپؑ کے کہنے سے رہی نہیں۔سخنوروں کو ناتواں کر دیا۔ یہ ایسے کلمات ہیں، جن پر نورِ نبوّت چمک رہا ہے اور عقلیں حیران و پریشان ہیں۔''

۱۱، ۱۲۔اس حصّے کو دو مسیحی شخصیات کے کلام پر ختم کرتے ہیں: عربی زبان کے معروف مسیحی مفکر میخائیل نعیمہ لکھتے ہیں:

''اگر علی ابن ابی طالب علیہما السلام صرف اسلام کے لیے تھے تو کیوں ایک عیسائی ۱۹۵۶ء میں ان کی زندگی پر غور و خوض کرتا ہے (اشارہ ہے جارج جرداق لبنانی مسیحی مؤلف: کتاب "اَلْاِمَامُ عَلِیٌّ صَوْتُ الْعَدَالَةِ الْاِنْسَانِیَّةِ" کی جانب) اور ایک دل باختہ شاعر کی طرح جو دل فریب واقعات، پُرمغز حکایات اور تعجب آور کارناموں کو غزلیہ انداز میں نظم کر رہا ہے، کیونکہ امام علیؑ کی پہلوانی صرف میدان حرب میں نہیں تھی، بلکہ بالغ نظری، طہارتِ قلبی، بلاغت، سحر بیانی، عظیم اَخلاقیات، ایمانی جذبہ، بلند ہمت، مساکین کی امداد، ناامیدوں کی امید اور حق وصداقت کی پیروی، بلکہ تمام صفاتِ حسنہ میں پہلوان تھے۔'' [۲]

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

''اس نابغۂ عرب نے جو سو چا وہ کر دکھایا، خدا کی قسم ایسے ایسے معاملات ہیں، جنہیں نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور اس سے کہیں زیادہ حقیقت ہے جسے مورّخوں نے قرطاس وقلم کے ذریعے محفوظ کیا ہے، گویا ہم کتنی ہی تعریف کریں وہ پھر بھی کم ہوگی۔'' [۳]

نہج البلاغہ کے عظیم وعمیق مطالب

نہج البلاغہ کی ممتاز خصوصیت، جس کی طرف ہر قاری بادی النظر متوجہ ہو جاتا ہے، اس کی جامعیت اور ہمہ گیر ہونے کے ساتھ مختلف انواع و اقسام کے پیغامات ہیں۔ انسان کا یقین کرنا مشکل ہے کہ ایک شخص اس طرح شیریں اور دقیق

---

[۱] تذکرۃ الخواص، باب ۶، ص ۱۲۸

[۲] ترجمہ وانتقاد از کتاب امام علیؑ ندای عدالتِ انسانیت، ص ۲

[۳] ترجمہ وانتقاد از کتاب امام علی ندای عدالتِ انسانیت، ص ۳

موضوعات پر، جو ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد بھی ہوں، گفتگو کر سکتا ہے۔ یہ کام سوائے امیر المومنین علی علیہ السلام کے جن کا سینہ اسرارِ الٰہی کا گنجینہ ہے اور علم و دانش کا عظیم سمندر ہے، ممکن نہیں۔ یہاں اس باب میں چند دانشوروں کے اقوال نقل کرتے ہیں:

۱۔ اہل سنّت کے معروف بزرگ عالم شیخ محمد عبدہٗ کے کلام سے آغاز کرتے ہیں، جب ان کی نگاہ نہج البلاغہ کے خطبات، خطوط اور کلماتِ قصار پر پڑی، تو انھوں نے بہترین انداز میں جائزہ لیتے ہوئے کہا:

جب بھی میں نہج البلاغہ کے ایک حصّے سے دوسرے حصّے کی طرف منتقل ہوا، مجھے احساس ہوا کہ مکمل طور پر نظر ہی تبدیل ہوگئی ہے؛ اپنے آپ کو اُس عالم میں پایا، جہاں ارواح کے بلند معانی، بہترین اور زیبا ترین عبارتوں کے لباس میں پاک نفوس کے گرد چکر کاٹ رہے ہیں اور پاک دلوں کے قریب ہو رہے ہیں، انھیں راہِ راست کی ہدایت کر رہے ہیں اور انھیں لغزشوں سے آگاہ کرتے ہوئے ہدف تک رسائی کا راستہ دکھا رہے ہیں اور فضل و کمال کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں۔

ایک دوسرے موقع پر دیکھا تو نہج البلاغہ کا چہرہ بالکل مختلف نظر آیا، اس طرح کہ جیسے کوئی حملہ آور حملے کے لیے تیار ہو۔ اور دشمن کو اپنی مرضی سے تسخیر کر لے اور بغیر کسی زور زبردستی کے ذہنوں پر حاکم ہو جائے اور مکمل طاقت سے باطل خیالات اور فاسد نظریات کو مٹا کر رکھ دے، کبھی اس طرح دیکھتا ہوں کہ جیسے ایک نورانی عقل جو مخلوقاتِ جسمانی سے کسی بھی طرح کوئی شباہت نہیں رکھتی، الٰہی لشکر سے جدا ہوئی اور ارواحِ انسانی سے متصل ہو جاتی ہے اور ارواح انسانی کو ظلماتی پردوں سے نکال کر ملکوتِ اعلیٰ کی طرف بلندیوں پر لے جاتی ہے اور انھیں نورِ اجلی تک پہنچا دیتی ہے اور انھیں عالم قدس میں مقام دیتی ہے کہ دھوکا دہی اور فریب خوری سے نجات نصیب ہو جائے۔

پھر کچھ دیر بعد حکمت آموز خطیب کے سخن میرے کانوں سے ٹکراتے ہیں کہ وہ دانشمندوں اور معاشرے کو چلانے والوں سے خطاب کرتے ہوئے صحیح راہ بتاتے ہیں اور ان کو شک و تردّد، خطاؤں سے بچاتے ہوئے سیاست کی روشنی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں اور حکومت کرنے کا بہترین درس اور تدبیری امور انھیں سکھاتے ہیں۔ ہاں یہ وہی کتاب ہے، جس میں سیّد رضیؒ نے مولا امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہما السلام کے کلمات کو جمع کیا ہے اور اس کا نام نہج البلاغہ رکھا ہے اور میں اس نام سے بہتر کوئی نام اس لائق نہیں جانتا جو اس کتاب کے مضامین و مواد کو بیان کر سکتا ہو۔ [1]

۲۔ نہج البلاغہ کے معروف شارح ابنِ ابی الحدید معتزلی اس بارے میں کہتے ہیں:

مجھے بہت تعجب ہوا اس مرد کے بارے میں جو میدانِ جنگ میں اس طرح خطبہ دیتا ہو، جس طرح کوئی شیر صفت ہو اور جب اس میدان میں وعظ و نصیحت کرتا ہے تو محسوس ہوتا ہے اس سے بہتر کوئی واعظ نہیں کہ جس سے نہ تو کسی جانور کا خون ہوا اور نہ

[1] شرح نہج البلاغہ شیخ محمد عبدہٗ صفحہ ۱۰

ہی اس نے کسی جانور کا گوشت کھایا ہو۔ کبھی وہ ''بسطام بن قیس ؓ'' اور ''عتیبۃ بن حارث ؓ'' اور ''عامر بن طفیل ؓ''[۱] کی صورت میں آشکار ہوتے ہیں اور کبھی حکیم سقراط، کبھی یوحنا اور کبھی مسیح بن مریمؑ کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ میں قسم کھاتا ہوں اُس کی جس کی تمام امتیں قسمیں کھاتی ہیں، میں خطبہ "اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ" (خطبہ ۲۲۱) کو پچاس سال سے مسلسل ہزار مرتبہ سے زیادہ پڑھ چکا ہوں، جب بھی پڑھتا ہوں ایک وحشت وخوف اور بیداری میرے وجود میں پیدا ہوجاتی ہے، جو دل پر گہرا اثر چھوڑتی ہے، میرے اعضاء میں لرزش پیدا ہوجاتی ہے۔ جب کبھی اس خطبے کے مضامین میں غور کیا، تو اپنے خاندان، رشتے داروں اور دوستوں میں مرنے والوں کا خیال دل میں آیا اور ایسا محسوس ہوا، گویا مولاؑ میرے بارے میں گفتگو فرما رہے ہیں۔ کتنے ہی واعظوں، خطیبوں، فصحاء نے اس موضوع پر بات کی، مگر حضرتؑ کے کلام کے علاوہ کسی کے کلام نے مجھ پر اثر نہیں کیا۔[۲]

۳۔ شیخ بہائی اپنی کتاب ''کشکول'' میں کتاب ''الجواہر'' سے ابوعبیدہ کا قول نقل کرتے ہیں: ''حضرت علی علیہ السلام نے نو (۹) جملے ایسے بیان فرمائے ہیں کہ عرب کے بلیغ افراد ایک جملہ بھی ان کے مقابلے میں لانے سے قاصر ہیں:۔ تین جملے مناجات کے، تین علوم اور تین ادب کے ہیں[۳] پھر ان (۹) نو جملوں کی شرح بیان کرتے ہیں، جن میں سے کچھ نہج البلاغہ میں اور کچھ مولا علیؑ کے دوسرے اقوال میں ہیں۔

۴۔ ڈاکٹر مبارک، کتاب ''عبقریۃ الشریف الرضیؒ'' میں لکھتے ہیں: میں سمجھتا ہوں کہ نہج البلاغہ پر غور وفکر اور تدبر انسان کو بہادری، شجاعت اور عظمت عطا کرتا ہے، کیونکہ نہج البلاغہ ایک روح پرور بزرگ کا کلام ہے، جس نے مشکلات اور حادثات کے مقابلے میں مانندِ شیر مقابلہ کیا ہے۔[۴] یہاں بات نہج البلاغہ کی عظمت اور روحِ شہامت، شجاعت اور روحانی بلندی کی ہے، جو نہج البلاغہ میں غور وفکر کے زیر سایہ میسّر ہے۔

۵۔ ابنِ ابی الحدید اس مقام پر کہتے ہیں: ''سبحان اللہ'' کون ہے، جس نے فضیلتیں اور شرف وگرانقدر خوبیاں اس نمونۂ عمل انسان ''علی علیہ السلام'' کو عطا کیں، کیسے ممکن ہے کہ ایک انسان جو ایک عرب (مکے) کا رہنے والا ہو اور جس نے عرب کے اس ماحول میں زندگی بسر کی ہو اور کسی فلسفی سے کبھی دوستی نہ رہی ہو، پھر بھی علومِ الٰہیہ اور حکمتِ متعالیہ میں افلاطون وارسطو سے زیادہ آگاہی رکھتا ہو، جو کسی بھی علم عرفان واَخلاق کے ماہر کے ساتھ نہ رہا ہو لیکن سقراط سے برتر ہو۔ جو بہادروں کے ساتھ نہ رہا

---

[۱] یہ تین افراد زمانۂ جاہلیت میں بہادری کے حوالے سے ضرب المثل تھے۔ (الاعلام زرکلی ج ۴ صفحہ ۲۰۱)

[۲] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، ج ۱۱، ص ۱۵۳

[۳] کشکول شیخ بہائی، ج ۳، ص ۳۹۷

[۴] عبقریۃ الشریف الرضیؒ، ج ۱، ص ۳۹۶

ہو، کیونکہ اہلِ مکہ تاجر تھے، جنگجو نہیں تھے اور شجاع ترین فرد ہو کہ گویا اُس جیسے نے اس زمین پر قدم ہی نہ رکھا ہو۔ [۱]

۶۔ سیّد رضیؒ نے بھی کہیں کہیں نہج البلاغہ کے موضوعات کے پُرمعانی ہونے پر اشارے کیے ہیں، جو قابلِ ملاحظہ ہیں، مثلاً اکیسویں خطبے کے ذیل میں کہتے ہیں:

"اِنَّ هٰذَا الْكَلَامَ لَوْ وُزِنَ بَعْدَ كَلَامِ اللهِ سُبْحَانَهُ وَ بَعْدَ كَلَامِ رَسُوْلِ اللهِ بِكُلِّ كَلَامٍ لَمَالَ بِهِ رَاجِحاً وَبَرَّزَ عَلَيْهِ سَابِقاً"

''مولا علی علیہ السلام کے کلام کا مقام بلند و برتر ہے، خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلام کے بعد اولین و آخرین میں اس کلام کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔''

پھر اکیسویں خطبہ میں اشارہ کرتے ہیں:

"فَاِنَّ الْغَايَةَ اَمَامَكُمْ وَ اِنَّ وَرَاءَكُمُ السَّاعَةُ تَحْدُوْ كُمْ وَخَفِّفُوْا تَلْحَقُوْا فَاِنَّمَا يُنْتَظَرُ بِاَوَّلِكُمْ آخِرُكُمْ"

''قیامت تمہارے مقابل ہے اور موت تمہیں ڈھونڈ رہی ہے، سامان اور بار کم کرو تا کہ جلدی اور تیز دوڑ سکو ورنہ قافلے سے پیچھے رہ جاؤ گے اور جان لو تم پیچھے رہ جانے والوں کے انتظار کے لیے روکے گئے ہو۔''

وہ کہتے ہیں:

یہ کلامِ خدا اور رسولؐ کے کلام کے بعد سب سے بلند و برتر کلام ہے۔ حکمت ۸۱ کے ذیل میں اس جیسا ہی کلام لاتے ہوئے کہتے ہیں، یہ وہ کلام ہے جس کی قیمت نہیں لگائی جاسکتی۔ ایسی حکمت ہے جس کے ہم وزن کوئی حکمت نہیں اور کوئی کلام اس کے ہم پلہ نہیں۔'' [۲]

۷۔ اس جگہ عنوانِ کلام مصر کے مشہور مصنّف عباس محمد العقاد کے سپرد کرتے ہیں اور ان کے ساتھ نہج البلاغہ کی سیر کرتے ہیں، وہ اپنی کتاب ''عبقریۃ الامامؑ'' میں بلند و بالا تعبیرات بیان کرتے ہیں، جو اس بات کی علامت ہے کہ وہ حضرت امام علی علیہ السلام کے متعلق گہری معرفت رکھتے ہیں۔ وہ ایک جگہ کہتے ہیں۔ نہج البلاغہ ایک ایسا اُبلتا ہوا چشمہ ہے، جس سے توحید و حکمت کی آیات جھلکتی ہیں، جو عقائد و خداشناسی کے اصول کو وسعت بخشتی ہیں۔ [۳]

---

[۱] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، ج ۱۶، ص ۱۴۶

[۲] العبقریات، ج ۲، ص ۱۳۸ (طبع دار الکتاب لبنانی)

[۳] العبقریات، ج ۲، ص ۱۴۵

ایک دوسرے مقام پر کہتے ہیں، اُن کا ہر کلام اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ بیانِ حقائق کی قدرت وصلاحیت اور ملکہ رکھتے تھے۔ بے شک یہ وہ فرزندِ آدمؑ ہیں جنہیں علمِ اسماء سکھایا گیا ہے اور "وَ عَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا" اور "اُوتُوا الْكِتَابَ" اور "فَصْلُ الْخِطَابِ" کا مکمل مصداق ہیں۔ [۱]

دوسرے مقام پر کہتے ہیں:

حضرت امام علی علیہ السلام سے جو بلند عظیم کلمات روایت ہوئے ہیں، ان سے برتر کلمات تصور نہیں کیے جاسکتے۔ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا: ''میری امّت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہیں''۔ اس حدیث کا مصداق حضرت علیؑ سے زیادہ کوئی نہیں، جن کے حکیمانہ کلمات انبیاءؑ کے کلمات کی طرح ہیں۔ [۲]

۸۔ معروف مصنف محمد امین نواوی، نہج البلاغہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

یہ وہ کتاب ہے، جسے خدا نے اس حقیقت پر حجّت قرار دیا ہے کہ علی علیہ السلام قرآن کے نور، اس کی حکمت اور معجزہ ہونے پر دلیل ہیں۔ اس کتاب میں ایسے مطالب ونکات جمع ہیں کہ سوائے علی علیہ السلام کے کوئی حکیم، فلسفی، عالم ربّانی اور نابغۂ روزگار فلسفہ اور اصولِ سیاست جیسے موضوعات کو بیان کرنے پر قادر نہیں تھا۔ [۳]

۹۔ ثقۃ الاسلام کلینیؒ کافی کی پہلی جلد میں توحید کے بارے میں حضرتؑ کے خطبے کو بیان کرتے ہیں:

یہ خطبہ بہت مشہور ہے، اکثر لوگ اسے جانتے ہیں اور جو توحید کے طالب علم ہیں، ان کا اس پر غور وفکر کرنا کافی ہے۔ اگر انبیاءؑ کے علاوہ تمام انس وجن کی زبانیں مل کر توحید کو بیان کریں تو ہرگز علیؑ (جن پر میرے ماں باپ فدا ہوں) جیسا کلام نہیں لاسکتیں۔ اگر حضرت علی علیہ السلام کے بیانات نہ ہوتے تو لوگوں کو معلوم نہ ہوتا کہ راہ توحید پر کیسے چلا جائے۔ [۴]

۱۰۔ مصر کے ایک اور معروف مصنّف ''ڈاکٹر طٰہٰ حسین'' کے بیانات میں ہے:

جب جنگ جمل میں شک وتردّد کے شکار ایک شخص نے حضرت علی علیہ السلام سے سوال کیا تو اُس کا کہنا ہے کہ آپؑ کا جواب ایسا تھا کہ ''میں نے وحی الٰہی کے بعد ایسا باعظمت، رساتر جواب نہ دیکھا نہ سنا''

۱۱۔ اس موضوع کو حضرت آیت اللہ علّامہ خوئیؒ اپنے اس کلام پر ختم کرتے ہیں:

امام علی علیہ السلام جب ''نہج البلاغہ'' کے خطبوں کو بیان کرتے ہیں، تو کسی اور کو اس موضوع پر بات کرنے کا اہل نہیں

---

[۱] العبقر یات، ج ۲، ص ۱۴۴

[۲] مصادر نہج البلاغہ، ج ۱، ص ۹۰

[۳] سیری ونہج البلاغہ، ص ۱۸، ۱۹

[۴] اصول کافی، ج ۱، ص ۱۳۶

چھوڑتے، یہاں تک کہ جو لوگ حضرت علیؑ کی زندگی کے بارے میں نہیں جانتے، وہ سمجھتے ہیں کہ گویا مولا علیؑ نے ساری زندگی اس موضوع کو بیان کرنے میں صرف کر دی''۔ [1]

نہج البلاغہ کی بے مثال جاذبیت

نہج البلاغہ کے پڑھنے والے تمام افراد چاہے وہ شیعہ دانشور ہوں، مسلم یا مسیحی علماء ہوں، بغیر کسی استثنٰی کے سب نے نہج البلاغہ کی بے مثال جاذبیت کو تسلیم کیا ہے۔ یہ کشش اور جاذبیت خطبوں، خطوط اور کلماتِ قصار میں بطور کامل محسوس کی جا سکتی ہے، جو سبب بنی ہے کہ دانشوروں نے نہج البلاغہ کی شرحیں لکھی ہیں اور حضرت علیؑ کی زندگی اور شخصیت پر کتب اور مقالات پیش کیے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ جاذبیت اور کشش چند چیزوں کی وجہ سے ہے جو درج ذیل ہیں:

۱۔ نہج البلاغہ میں مظلوموں، محروم اور ستم رسیدہ افراد سے ہمدردی اور ظلم، بے انصافی، استعمار اور طاغوت سے نفرت کی بات ہوئی ہے۔ عہدنامۂ مالکِ اشترؓ میں مختصر سی عبارت کے ذریعے مملکت کے امور سنبھالنے سے متعلق بیان ہے، جس میں معاشرے کے سات طبقات اور ان کی ذمے داریاں اور ان کے حقوق کو بہت آرام اور سکون سے بیان فرمایا، مگر جوں ہی محروم و مظلوم طبقے کی بات آئی تو گویا امامؑ کے کلام کو پرواز مل گئی اور دل کی گہرائی سے فرمایا:

''اَللّٰهَ اَللّٰهَ فِي الطَّبَقَةِ السُّفْلٰى مِنَ الَّذِيْنَ لَا حِيْلَةَ لَهُمْ مِنَ الْمَسَاكِيْنِ وَ الْمُحْتَاجِيْنَ وَ اَهْلِ الْبُؤْسٰى وَ الزَّمْنٰى''

''خدا کے لیے، خدا کے لیے اے مالکِ اشترؓ نچلے درجے کے افراد جو مظلوم، محروم، ضرورت مند، ستم دیدہ اور مجبور ہیں، اُن کے ساتھ اپنا برتاؤ اچھا رکھو۔ اُن کے پاس کسی اور کو نہ بھیجنا، خود ان کا خیال کرنا اور پوری مملکت میں ان پر نظر رکھنا اور کسی اور کو ان کے معاملات میں مداخلت کرنے نہ دینا اور مسلسل ان سے ملاقات رکھنا، تاکہ سب کی مشکلات عدل و انصاف کے ساتھ دور ہو جائیں۔'' اور یہ فرمان صرف اسی جگہ نہیں بلکہ مختلف مقامات پر آپؑ نے ان کے بارے میں سفارش فرمائی ہے۔

۲۔ نہج البلاغہ انسانی آزادی، غلامی سے نجات، ہوا و ہوس سے آزادی، ذلّت و خواری سے آزادی اور ثروت مندوں کے حملوں سے آزادی دلانے کے لیے ہر موقع سے استفادہ کرنے کا درس دیتی ہے اور حضرتؑ نے سمجھایا کہ جہاں بھی

---

[1] البیان، ص ۹۰

مادّی نعمتوں کے انبار لگے ہوں جان لو کہ وہاں دوسروں کے حقوق پائمال کیے گئے ہیں۔[۱] امامؑ متنبہ کرتے ہیں کہ آزادی، مساوات اور عدالت کی راہ میں کسی بھی دھمکی کو برداشت نہ کیا جائے بلکہ حضرتؑ نے تو حکومتی اعلیٰ منصب اسی وجہ سے قبول کیا تھا[۲] اور جو لوگ اس خام خیالی میں تھے کہ حضرت علی علیہ السلام اس موضوع پر کوئی سودا بازی کریں گے وہ کھلی گمراہی میں تھے جو امام علی علیہ السلام کو نہ پہچاننے کی دلیل ہے۔[۳]

۳۔ نہج البلاغہ کی عرفانی جاذبیت اور کشش ایسی ہے کہ روحانیت و معنویت کی تشنہ ارواح کو سیراب کر دیتی ہے اور جب معرفت خدا اور صفاتِ جمال و جلالِ الٰہی کی بات آتی ہے تو نہج البلاغہ پڑھنے والے کو محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ فرشتوں کے بال و پر کا سوار ہے اور ایسے ایسے آسمانوں کی سیر کر رہا ہے جہاں تک رسائی ممکن نہیں تھی۔[۴] اور جب بے حس اور سوئی ہوئی روحوں کی بیداری کی بات آتی ہے تو تازیانۂ سخن ایسے چلتا ہے کہ گویا زندگی ختم ہو رہی ہے اور جب گزشتہ اُمتوں کی گفتگو ہوتی ہے تو ایسا لرزہ طاری ہوتا ہے کہ گویا دردناک بھی ہے اور لذت آور بھی۔[۵]

۴۔ نہج البلاغہ کی ایک اور جاذبیت جس کی طرف پہلے بھی اشارہ ہوا ہے کہ ہر میدان میں ایسے قدم رکھا ہے کہ گویا حق سخن ادا کر دیا اور ہر چیز کی ہر زاویے سے شرح کی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کہنے والے نے تمام زندگی انہی موضوعات پر صرف کی ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں کیا۔ جب حضرت امام علیؑ خطبۂ توحید کا آغاز کرتے ہیں اور اسماء، صفاتِ جمال و جلال پر گفتگو کرتے ہیں تو ایک عظیم فلسفی کا چہرہ دکھائی دیتا ہے، جس نے عرصۂ دراز تک صرف توحید پر گفتگو کی ہو۔ وہ ایسے گراں بہا گُہر پیش کرتے ہیں جو اس سے قبل بیان نہیں ہوئے، نہ تجسّم خدا نہ صفات کی تفصیل بلکہ اس طرح کا اندازِ گفتگو کہ انسان، دل کی آنکھوں سے زمین و آسمان اور خود کو اپنے لیے حاضر محسوس کرتا ہے اور روح معرفتِ الٰہی سے سرشار ہو جاتی ہے۔ پھر ہماری نگاہ جب ان خطبات پر پڑتی ہے، جو جہاد کے بارے میں ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ایک سپہ سالار شجاع و دلیر، لباسِ جنگ زیب تن کیے جنگی آداب بیان کرتا ہوا نظر آ رہا ہے کہ جیسے اس نے تمام عمر میدانِ جنگ میں گزار دی ہو۔

۵۔ جب ہم نہج البلاغہ کی ورق گردانی کرتے ہیں تو حضرت امام علی علیہ السلام کو کرسی، حکومت اور رہبری اُمّت پر پاتے ہیں کہ آپ گورنروں کو حکومت چلانے کے احکامات صادر کرتے ہیں۔ تمدن کے انحطاط سے بچنے اور ترقی کے رموز، ظالم

---

[۱] حضرت امام علیؑ (صدائے عدالتِ انسانیت) ج ۳، صفحہ ۱۷۷۔
[۲] خطبۂ شقشقیہ، خطبہ ۳
[۳] عثمان بن حنیف کے نام (نامہ ۴۵)
[۴] خطبۂ اوّل اور خطبہ اشباح، خطبہ ۹۱
[۵] خطبہ ۱۰۹، ۱۱۱، ۱۱۳ و دیگر

قوموں اور ستمگروں کا انجام اور معاشرتی و سیاسی بہتری وسکون حاصل کرنے کے طریقے پختہ ترین عبارات کے سانچے میں ایسے بیان کرتے ہیں گویا صرف انہی امور میں آپ نے ساری زندگی صرف کی ہے۔ پھر مسند اَخلاق پر آپ کو پاتے ہیں تو تہذیبِ نفس، تربیتِ افکار و ارواح کا درس دیتے ہیں۔ ''ہمام'' آپ سے متقیوں کی صفات بیان کرنے کا تقاضا کرتے ہیں، وہ اتنے پیاسے تھے کہ ایک دو جام سے سیراب ہونے والے نہیں تھے۔

حضرتِ امام علی علیہ السلام اُن کو اس طرح علم و دانش عطا کرتے ہیں کہ پرہیزگاروں کی تقریباً سو (۱۰۰) صفات جو محکم عبارات اور گہرے مطالب سے آراستہ ہیں، بیان فرماتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے ہزاروں برس اس مسند پر آپ بیٹھے رہے اور یہ ہی کام کرتے رہے ہوں۔ تاریخ میں ایسے سخنور کی اور کہیں نظیر نہیں ملتی، نہج البلاغہ کے یہ مختلف زاویے جو ہر ایک اپنی جگہ بے مثال ہے، اس کتاب کے عجائب اور خصوصیات میں شمار ہوتے ہیں۔

نہج البلاغہ کی جاذبیت اور اہم شخصیات کی تعبیرات

سیّد رضیؒ خود ایک عرب کے نامور ادیب شمار ہوتے ہیں، خطبات کے ذیل میں ایسی تعبیرات بیان کرتے ہیں کہ جو سننے والے کو مجذوب اور متاثر کرتی ہیں:

(الف) خطبہ غراء (خ ۸۳) میں آیا ہے:

''وَ فِی الْخَبَرِ أَنَّهُ لَمَّا خَطَبَ بِهٰذِهِ الْخُطْبَةِ اِقْشَعَرَّتْ لَهُ الْجُلُوْدُ وَ بَكَتِ الْعُيُوْنُ وَ رَجَفَتِ الْقُلُوْبُ''

''جب حضرت علی علیہ السلام نے یہ خطبہ بیان کیا تو بدن لرزنے لگے، آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور دل مضطرب ہو گئے۔''

(ب) خطبہ ہمّام کے ذیل میں (ہمام، جنہوں نے صفاتِ متقی کا تقاضا کیا تھا) ہم پڑھتے ہیں:

جب امامؑ خطبے کے حساس ترین موڑ پر آئے، ہمام نے ایک آہ بھری اور بے ہوش ہو گئے، زمین پر گرے اور ان کی روح جسم سے پرواز کر گئی۔ امامؑ نے فرمایا، مجھے اس بات کا خوف تھا اور میں ہمام کے مطالبے کو قبول نہیں کر رہا تھا مگر۔۔۔! پھر فرمایا کہ آیا ایسا نہیں کہ جو اہل ہیں، اُن پر نصیحت اثر کرتی ہے۔

(ج) اسی طرح خطبہ ۲۸ کا بیان ہے، جو انسان کی فکر و جان پر اثر انگیز اور اسے اپنی طرف جذب کرتا ہے، اُس کے بارے میں سیّد رضیؒ فرماتے ہیں، ''اگر کلام ایسا ہو جو لوگوں کو زہد کی طرف لے جائے اور آخرت کے لیے عمل کرنے کی

ترغیب دے، تو وہ طولانی آرزوؤں سے دور کرتا ہے اور بُرے اعمال سے نفرت دلاتا ہے۔''

پھر اس خطبے کی تعبیرات کی طرف توجّہ دلاتے ہیں، ''اس خطبے کا گہری فکر ونظر سے مطالعہ کرو کہ اس میں باطنی حیرت انگیزی اور عجیب گہرائی موجود ہے، جو امامؑ کے اکثر کلام میں پائی جاتی ہے۔''

(د) اسی طرح خطبہ ۱۶ کے ذیل میں بیان کرتے ہیں، اس کلام میں حقیقت سے نزدیک ترین فصیح ولطیف کلام پنہاں ہے کہ کوئی کلام اس تک رسائی نہیں پا سکتا۔ اور ہمیں حیرت میں ڈال دیتا ہے کہ فصاحت کی باریک بینی اور موشگافیاں جنہیں بیان کرنے سے انسانی زبان قاصر ہے اور انسان جن کی گہرائیوں تک رسائی کی قدرت نہیں رکھتا، "وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُوْنَ" اور سوائے دانش مندوں کے کوئی اور درک نہیں کرسکتا۔

(ھ) خطبۂ شقشقیہ کی شرح میں ابن عباسؓ (محدّث ومفسر قرآن) کا بیان، جو کہ اس خطبے میں آپؑ کی محویت کا ثبوت ہے:

"فَوَ اللهِ مَا أَسَفْتُ عَلٰى كَلَامٍ قَطُّ كَأَسَفِيْ عَلٰى هٰذَا الْكَلَامِ أَنْ لَا يَكُوْنَ أَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ بَلَغَ مِنْهُ حَيْثُ أَرَادَ"

''خدا کی قسم کبھی مجھے اتنا افسوس نہیں ہوا جتنا اب ہو رہا ہے کہ یہ کلام کیوں مکمل نہ ہوا۔''

امیر المومنینؑ جس مقام تک پہنچنا چاہتے تھے، آپ نے وہ مقام بیان نہیں کیا (ایک شخص ماحول کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک خط امامؑ کو دیتا ہے، جس کی وجہ سے امامؑ کا کلام قطع ہو جاتا ہے)

اس گفتگو کو محقق خوئی، منہاج البراعہ اور ابن ابی الحدید کے کلام پر ختم کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں:

کسی بھی کلام کا حضرت علی علیہ السلام کے کلام سے باعظمت ومنظم ہونے کے اعتبار سے موازنہ نہیں کرسکتے؛ اس میدان میں میرا مولاؑ تنہا ترین فرد ہے، ایسا خطیب ہے جس کے بیان سے غضب واضطراب ختم ہو جاتا ہے؛ ایسا سمندر ہے جو ساحل پر موتی بکھیرتا ہے اور دلوں پر حکومت کرتے ہوئے انہیں امر ونہی کی پیروی کی طرف لے جاتا ہے؛ نیکیوں پر دلائل اور بیدار کُن کلام کے تازیانوں کے ذریعے منکرات سے دور کرتا ہے اور یہی وجہ ہے:

"فَحَقِيْقٌ بِكَلَامِهِ أَنْ يُّجْعَلَ إِمَامَ الْكَلَامِ كَمَا أَنَّهُ إِمَامُ الْأَنَامِ" [1]

''اُن کا کلام دوسرے تمام کلاموں کا پیشوا کہلوانے کا سزاوار ہے، جس طرح وہ خود سب کے پیشوا ہیں۔''

بالآخر ابن ابی الحدید خطبہ ۱۰۹ کے آغاز میں اس حقیقت کو بیان کرنے کے بعد (کہ جو چاہتا ہے فصاحت وبلاغت

---

[1] منہاج البراعہ ج ۱ صفحہ ۲۷۱

کے امور سے آگاہی حاصل کرے وہ اس خطبے پر ضرور غور کرے) کہتے ہیں "اس خطبے کی تاثیر اور جاذبیت ایسی ہے کہ بے دین و ملحد انسانوں کے سامنے جو قیامت کے منکر ہیں پڑھا جائے تو وہ مضمحل ہو جائیں گے اور ان کے دل وحشت زدہ ہو کر ان کے منفی ارادے کو کمزور کر دیں گے ان کے اعتقاد میں دراڑیں پڑ جائیں گی۔ خدا اس کلام کے کہنے والے کو جزائے خیر دے اور بہترین جزا جو اُس نے اپنے اولیاء کو دی ہے۔ کیا بہترین مددگار ہے جو اسلام کی کبھی ہاتھ سے کبھی تلوار، کبھی زبان و بیان وقلب وفکر سے مدد کرنے والا ہے، ہاں یہی "سَیِّدُ الْمُجَاهِدِینَ وَ أَبْلَغُ الْوَاعِظِیْنَ وَ رَئِیْسُ الْفُقَهَاءِ وَ الْمُفَسِّرِیْنَ وَإِمَامُ أَهْلِ الْعَدْلِ وَالْمُوَحِّدِیْنَ" ہے۔[1]

نہج البلاغہ کی اسناد

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ نہج البلاغہ میں خطبات، مکتوبات اور کلماتِ قصار بطور روایات مرسل سیّد رضیؒ نے جمع کیے ہیں، یعنی ایسی کوئی سند نہیں ہے جو معصومینؑ تک پہنچے، اس بناء پر بعض لوگوں نے اس میں شک و تردّد کا اظہار کیا ہے، بالخصوص وہ لوگ جو سوچتے تھے کہ نہج البلاغہ اپنے اعلیٰ معیار کی وجہ سے مذہبِ شیعہ کی حقانیت اور فضیلت، نیز تمام اصحاب پر حضرت امام علی علیہ السلام کی برتری کو ثابت کرنے کے لیے ایک بہترین سند ہے، انہوں نے اس عظیم کتاب کی اہمیت کو مسلمانوں کے ذہنوں سے کم کرنے کے لیے "سند" کو ایک بہانہ قرار دیا۔

خوش قسمتی سے ان ہتھکنڈوں کی وجہ سے اسلامی مفکرین کے افکار پر کوئی فرق نہیں پڑا بلکہ اہلسنّت اور اہلِ تشیع کے علماء نے اس کی تعریف و تمجید میں بیانات اور تحریریں پیش کیں۔ نیز اس کتاب کے اَسرار و رموز کو بیان کرنے کے لیے شرحیں تحریر کی ہیں، جس کے بعض نمونے پہلے بیان ہو چکے ہیں، لیکن بہر حال ضروری ہے کہ ان شکوک و شبہات کو دور کرنے کے لیے نہج البلاغہ کی اسناد کے بارے میں وضاحت کی جائے تا کہ اس نورانی چہرے سے شبہات کی گرد و غبار دور ہو جائے۔ چنانچہ ان دو نکات کی طرف توجّہ دینا ضروری ہے:

۱۔ نہج البلاغہ کے اکثر خطبات، مکتوبات اور کلماتِ قصار بلکہ سب کے سب بالاتفاق ایسے مضامین پر مشتمل ہیں، جو منطقی دلائل کے ہمراہ ہیں اور حقیقت میں اس قول "قَضَایَا قِیَاسَاتُهَا مَعَهَا" کا عملی مصداق ہیں، ایسے مضامین جن کے دلائل خود انہی میں پوشیدہ ہیں۔ چنانچہ اسناد ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ نہج البلاغہ کے اکثر موضوعات اعتقادات پر مشتمل ہیں مثلاً مبداء و معاد، خدا کی صفات، عظمتِ قرآن و رسولؐ پر دلائل وغیرہ۔ جبکہ دوسرا حصّہ پند و نصیحت، گزشتہ اقوام کی

[1] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، ج ۷، ص ۲۰۲ خلاصے کے ساتھ۔

زندگی سے درسِ عبرت، اجتماعی زندگی، جہاد کے آداب وغیرہ جو منطقی مطالب اور دلائل پر مشتمل ہے، جیسا کہ عظیم فلسفیوں کے مقالات، ماہرین علوم کی تحریریں، شعراء کے اشعار وغیرہ سند کے بغیر مقبول اور قابلِ قبول ہیں۔ نہج البلاغہ کے حوالے سے بھی بطریق اولیٰ سند کی کوئی ضرورت نہیں، کیوں کہ ان کے دلائل بھی ان کے ساتھ ہیں۔ بقول معروف "قَضَایَا قِیَاسَاتُهَا مَعَهَا"، نہج البلاغہ کا ایک مختصر حصہ فروعات تعبدیہ پر مشتمل ہے اور سند کی ضرورت صرف اسی حصے کے لیے ہے۔ جو نہج البلاغہ کا دسواں حصّہ بھی نہیں ہے۔ بنابرایں نہج البلاغہ کی اسناد کے حوالے سے اعتراضات بے اثر ہیں۔

۲۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اگر نہج البلاغہ کی سند کو حجیّت کے معیار پر لائیں تو اس حوالے سے بھی کوئی مشکل نہیں ہے، کیونکہ حدیث وروایات کو تسلیم کرنے کے لیے جس طرح علم اصول میں تحقیق کی گئی ہے، اس کا اصلی معیار اعتماد واطمینان ہے، جو ممکن ہے مختلف طریقے سے بیان ہو۔ کبھی قابلِ اعتماد، راویوں کا سند میں ہونا روایت کو قابلِ اعتبار بناتا ہے اور کبھی روایت کی کثرت اور متعدد ہونے کی بنا پر اطمینان حاصل ہوتا ہے اور وہ بھی معتبر کتابوں سے اعتماد حاصل ہوتا ہے اور کبھی کلام کی بلندی، عمیق معانی ومفاہیم خود اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ کلام رسول اللہؐ یا امام معصومؑ کی فکر ہے۔

اسی معیار کی کتاب صحیفۂ سجادیہؑ ہے، جس کی معتبر سند بھی موجود ہے، اور عالی ترین مطالب ومعانی اور مفاہیم خود اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ مضامین امام سجاد علی بن الحسین علیہما السلام کے ہیں۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ اگر کوئی نہج البلاغہ کے معانی ومفاہیم میں غور وفکر کرے تو کہیں نہ کہیں وہ اعتراف ضرور کرے گا کہ یہ ایک عام انسان کا کلام نہیں ہوسکتا۔ یقیناً یہ کلام رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا امامِ معصومؑ کی زبان سے ادا ہوا ہے۔ اہلِ تشیّع اور اہلِ سنّت کے بزرگ علماء نے نہج البلاغہ کی تعریف میں کہا ہے کہ یہ خالق کے کلام کے نیچے اور مخلوق کے کلام کے اوپر ہے۔ آمد آفتاب خود دلیلِ آفتاب ہے۔ نہج البلاغہ کے مضامین خود دلیل وسند ہیں کہ یہ امامِ معصومؑ سے صادر ہوئے ہیں اور یہ نسبت صرف حضرت علی علیہ السلام کی طرف ہے اور ہمیں یقین ہے کہ یہ کلام اسی امامؑ کا ہے۔ کون یہ احتمال دے سکتا ہے کہ یہ ایک عام انسان یا مفکر نے بنا کر امام علیؑ کی طرف نسبت دی ہے؟ کون ہے وہ شخص جو ایسا کرسکتا ہو کہ اس کا ایک حصّہ بھی ایجاد وانشاء کرسکے؟ وہ خود اپنی طرف نسبت کیوں نہیں دیتا کہ ساری دنیا اس کے لیے تعریف وتمجید کرنے لگے۔

سیّد رضیؒ کی شخصیت، سچائی اور مقام ومنزلت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے معتبر منابع دیکھے بغیر اس صراحت کے ساتھ امام علی علیہ السلام کی جانب نسبت نہیں دی ہے کہ امیر المومنینؑ سے روایت ہے۔ یہ امامِ عالی مقام علیہ السلام کے خطبات، مکتوبات اور کلماتِ قصار وغیرہ ہیں۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک مفکر صراحت کے ساتھ کسی کلام کو اپنے معصوم رہنما سے نسبت دے جبکہ اس کی کوئی معتبر سند بھی نہ رکھتا ہو؟ اس کتاب سے پہلے سیّد رضیؒ نے مختلف کتابیں تالیف کی

ہیں، ان کتابوں میں نہج البلاغہ کے خطبات، مکتوبات اور کلماتِ قصار ذکر ہوئے ہیں اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سیّد رضیؒ سے پہلے بھی یہ کلام مفکرین، راویانِ حدیث اور عام لوگوں کے درمیان معروف و مشہور تھا۔ اسی شہرت کی بنا پر ہم اسنادِ متصل کو بیان کرنے سے بے نیاز ہیں۔ یہاں تک کہ بعض مورّخین نے لکھا ہے سیّد رضیؒ سے پہلے بھی نہج البلاغہ کے خطبات عوام کے درمیان مشہور تھے، یعنی درحقیقت نہج البلاغہ ان ہی تمام خطبات کا دل آویز گلدستہ ہے۔

من جملہ مشہور مورّخ ''مسعودی'' جو سیّد رضیؒ سے ایک صدی پہلے تھے، اپنی کتاب ''مروّج الذہب'' میں امام علیؑ کے خطبات کے حوالے سے انہوں نے یوں تحریر کیا ہے:

"وَالَّذِيْ حَفِظَ النَّاسُ عَنْهُ مِنْ خُطَبِهِ فِيْ سَائِرِ مَقَامَاتِهِ أَرْبَعُ مِاۤئَةٍ وَنَيِّفٌ وَثَمَانُوْنَ خُطْبَةً" [1]

''لوگوں نے مختلف مقامات پر امامؑ کے خطبات کو محفوظ کیا، چار سو اسّی سے بھی زیادہ ہیں۔''

جبکہ (نہج البلاغہ) میں دو سو چالیس خطبات ہیں۔''

دوسرے معروف مورّخ سبط ابنِ جوزی نے کتاب (تذکرۃ الخواص) میں سیّد مرتضیٰؒ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

''امامؑ کے چار سو خطبات میرے پاس موجود ہیں۔''[2]

معروف مسلم مفکّر جاحظ اپنی کتاب (البیان والتبیین) میں یوں تحریر کرتے ہیں:

''امام علی علیہ السلام کے خطبات ہمیشہ سے معروف و مشہور رہے ہیں۔''[3]

ایک اور دانشور ابن واضح نے اپنی کتاب "مشاکلۃ الناس لزمانهم"[4] میں یوں تحریر کیا ہے:

''لوگوں نے امام علیؑ کے متعدد خطبات حفظ کیے ہوئے ہیں۔ انہوں نے چار سو خطبات پڑھے، جنھیں لوگوں نے حفظ کیا اور وہی خطبات ہمارے درمیان رائج ہیں اور ان سے اپنی تقاریر میں استفادہ کرتے ہیں۔''

اس وقت چند کتابیں موجود ہیں، جن کو عصرِ حاضر کے فضلاء اور بزرگانِ دین نے نہج البلاغہ کی اسناد اور مصادر کے عنوان سے جمع کیا ہے، جو سیّد رضیؒ سے قبل منظر عام پر آئی ہیں۔ اس حوالے سے سب سے بہترین کتاب محقق السیّد عبدالزہراء الحسینی الخطیب کی تالیف کردہ کتاب ''مصادر نہج البلاغہ واسانیدہ'' ہے۔ اس کتاب کی طرف رجوع کرنے والا اس حقیقت

---

[1] مروّج الذہب، ج ۲، ص ۴۱۹، ناشر دار الہجرۃ قم

[2] تذکرۃ الخواص، ص ۱۲۸

[3] البیان والتبیین، ج ۱، ص ۸۳

[4] مشاکلۃ الناس لزمانهم، ص ۱۵

سے بخوبی آگاہی حاصل کرتا ہے کہ ان خطبات کو نقل کرنے والے سیّد رضیؒ اکیلے نہیں ہیں۔ قابلِ توجّہ بات یہ ہے کہ اس کتاب میں نہج البلاغہ کے علاوہ ایک سو چودہ دوسری کتابیں بھی ذکر ہوئی ہیں، جن میں سے زیادہ کتابیں ان علماء کی ہیں، جو سیّد رضیؒ سے قبل زندگی گزار چکے ہیں، البتہ زیادہ معلومات حاصل کرنے کے لیے اہلِ ذوق اس کتاب کی طرف رجوع کر سکتے ہیں، کیوں کہ یہاں اس سے زیادہ تحریر کی گنجائش نہیں ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ سیّد رضیؒ نے نہج البلاغہ کے خطبات کی وضاحت کرتے ہوئے پندرہ کتابوں کے نام لیے ہیں۔ [۱] جن سے سیّد رضیؒ نے نہج البلاغہ کی تالیف میں استفادہ کیا ہے۔ اس طرح ان کتابوں کے ساتھ مندرجہ بالا کتابوں کے مجموعے کو مدنظر رکھتے ہوئے نہج البلاغہ کی اسناد میں شک وتردّد کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

نہج البلاغہ کی شرحیں

اس مقدمے کی آخری بات مختصر طور پر اس کتاب کی شروح اور تراجم کے حوالے سے ہے، جو مسلم مفکرین نے سیّد رضیؒ کے دور سے لے کر اب تک کیے ہیں اور جوں جوں ہم سیّد رضیؒ کے زمانے سے دور ہوتے جاتے ہیں، اتنا ہی شروح، تفاسیر اور تراجم میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور یہ اس وجہ سے ہے کہ ہر دن نہج البلاغہ پر غور وخوض بڑھتا جا رہا ہے۔ نہج البلاغہ کے حوالے سے مختلف دروس اور سیمینار وغیرہ منعقد کیے جاتے ہیں جو ہمارے مدّعا پر دلالت کرتے ہیں۔ علاّمہ امینیؒ مرحوم نے کتاب الغدیر میں سیّد رضیؒ کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے یوں تحریر فرمایا ہے: سیّد مرحوم کے زمانے سے لے کر آج تک نہج البلاغہ کی ستّر سے زیادہ شروح منظرِ عام پر آچکی ہیں۔

علامہ امینیؒ نے ان شروح کے مؤلفین، ان کی تاریخ وفات اور تراجم کا اکیاسی (۸۱) شروح اور تراجم کے نام سے ذکر کیا ہے۔ [۲] ظاہر ہے کہ ان شروح میں سے ہر ایک نے قرآن مجید کی تفاسیر کی طرح نہج البلاغہ کی بھی مختلف زاویوں سے شرح وتفسیر کی ہے۔ کسی نے ادبی، کسی نے تاریخی اور کسی نے فلسفی، تربیتی اور اجتماعی مسائل پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ مصادرِ نہج البلاغہ کے مؤلف نے اپنی کتاب میں ایک سو دس شروح اور تفاسیر کے نام لیے ہیں، بعض فضلا نے کتاب نامہ نہج البلاغہ

---

[۱] وہ کتابیں جن سے سیّد رضیؒ نے استفادہ کیا ہے حسب ذیل ہیں۔ ۲: البیان والتبیین مؤلف جاحظ۔ ۲: تاریخ طبری۔ ۳: الجمل مؤلف واقدی۔ ۴: المغازی مؤلف سعید ابن یحییٰ اموی۔ ۵: المقامات مؤلف ابی جعفر اسکافی۔ ۶: المقتضب مؤلف مبرد۔ ۷: حکایۃ ابی جعفر محمد ابن علی الباقر علیہ السلام۔ ۸: حکایۃ ثعلب عن ابن الاعرابی۔ ۹: خبر ضرار الضبائی۔ ۱۰: روایۃ ابی جحیفہ۔ ۱۱: روایۃ کمیل ابن زیاد النخعی۔ ۱۲: روایۃ مسعدۃ بن صدقۃ لخطبۃ الاشباح عن الصادق جعفرؑ ابن محمدؑ۔ ۱۳: روایۃ نوف البکالی۔ ۱۴: ماذکرہ ابوعبید القاسم بن سلام، من غریب الحدیث۔ ۱۵: ماوجد بخط ہشام بن الکلبی۔

[۲] الغدیر، ج ۴، ص ۱۸۴ تا ۱۹۳

میں تین سو ستّر شروح، تراجم اور تفاسیر کا بھی ذکر کیا ہے۔[۱]

مگر اس کے باوجود اس کتاب کے لیے متعدد شروح اور بھی درکار ہیں تا کہ معانی کے جواہرات کو الفاظ کے صدف سے باہر نکالیں۔ نہج البلاغہ کے عظیم دریا میں غوطہ زن ہو کر معانی کے یاقوت کو باہر نکالیں، عصر حاضر اور مستقبل کی ضروریات کا حل پیش کریں، کیوں کہ نہج البلاغہ بھی امام علیؑ کی طرح وسیع اور عمیق ہے، جس تک پہنچنا آسان نہیں۔ البتہ جن شروح اور تراجم کی طرف اشارہ ہوا ہے وہ کامل اور جامع نہیں ہیں۔ بعض لوگوں نے نہج البلاغہ کے بعض حصوں کی شرح کی ہے، البتہ ان شروح میں سے بعض کامل و جامع شرحیں ہیں جن کو خاص امتیازات حاصل ہیں اور وہ عظیم علمی کام ہیں۔ ان میں سے ہم بعض کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ ''**اعلام نہج البلاغہ**'' علامہ امینیؒ کے بقول یہ سب سے پرانی شرح ہے۔ اس کے مؤلف ''علی بن الناصر'' ہیں، جو سیّد رضیؒ کے ہم عصر تھے۔

۲۔ ''**منہاج البراعۃ**'' مؤلف سعید الدین ھبۃ اللہ قطب راوندی چھٹی صدی ہجری کے علماء میں سے تھے۔

۳۔ ''**شرح ابن ابی الحدید معتزلی**'' بیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ ساتویں صدی ہجری کے علماء میں سے تھے۔ یہ شرح نہج البلاغہ کی مشہور شروح میں سے ایک ہے۔

۴۔ ''**شرح ابن میثم بحرانی**'' ساتویں صدی ہجری کے علماء میں سے تھے، بہت جالب اور عمدہ شرح ہے۔

۵۔ ''**منہاج البراعۃ**'' مؤلف مرحوم حاج میرزا حبیب اللہ موسوی خوئی، چودھویں صدی ہجری کے علماء میں سے تھے، یہ شرح خوئی کے نام سے معروف ہے۔

۶۔ ''**شرح شیخ محمد عبدہٗ**'' اہلسنّت کے مشہور و معروف علماء میں سے تھے، جو تیرھویں صدی ہجری کے علماء میں سے تھے۔ عصرِ حاضر کے بعض علماء و فضلاء نے بھی نہج البلاغہ کی شروح تالیف کی ہیں، ان تمام کو یہاں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔

قابلِ توجّہ بات یہ ہے کہ **مرحوم محدث تہرانی** نے کتاب الذریعۃ میں نہج البلاغہ کے شارحین کے ایک سو چالیس نام تحریر کیے ہیں، اہل سنّت کی سولہ شروح کو بیان کیا ہے، جن میں سے سب سے قدیم شرح **فخر رازی** کی ہے، جو ۶۰۶ھ میں وفات پا گئے تھے۔[۲]

---

[۱] المعجم المفہرس اقتباس از نہج البلاغہ ص ۱۰

[۲] الذریعہ، ج ۱۴، ص ۱۱۱، ۱۶۰

''تمہید از سیّد رضیؒ قدس سرہ''

وجہ تدوین نہج البلاغہ

حمد و تعریف اُس خداوند کے لیے جس نے حمد کو نعمتوں کی قیمت، بلاؤں کے لیے پناہ گاہ، نعمت اور ابدی جنت تک پہنچنے کا وسیلہ اور اپنے فضل و کرم میں افزائش کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ درود و سلام ہو پیغمبر رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو رہبران الٰہی کے سردار، امّت کے لیے ایسا روشن چراغ ہے کہ جن کے سراسر وجود سے عظمت و بزرگواری چھلکتی ہے اور جن کی قامت میں عزت، جن کے وجود کے سرچشمے میں عزت و افتخار، شاخوں میں عظمت و بلندی، حسب و نسب پُر برگ و ثمر ہیں اور ان کے اہلِ بیت علیہم السلام پر جو ظلمتوں سے نجات کے چراغ، امّت کی نجات کا وسیلہ، دین کی روشن علامت، فضیلت و برتری کا معیار ہیں، درود و سلام ہو۔

ایسا درود و سلام جو ان کی فضیلت و بزرگی کے برابر ہو، اور جو ان کے اعمال کی پاداش قرار پائے۔ ایسی پاداش جو کہ اصل و فرع کی پاکیزگی کے ساتھ مناسبت رکھتی ہو۔ اُن پر درود و سلام ہو، اس وقت جب صبح کی سفیدی رات کے گریباں کو چاک کرتی ہے، ستارے طلوع و غروب کرتے ہیں۔ میں نے اپنی جوانی کے آغاز میں خصائص ائمہ علیہم السلام کے نام سے ایک کتاب تالیف کی جو ان ہستیوں کے دیدہ زیب اور دل نشین کلام پر مشتمل تھی۔ اس کام کے سبب کو کتاب کے آغاز میں ذکر کیا ہے اور اسی کو عنوانِ کلام قرار دیا ہے۔

اس کتاب میں امیر المومنینؑ کی خصوصیات کو جمع کرنے کے بعد زمانے کے حوادث اور مشکلات کی بنا پر تحریر کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکا۔ اس کتاب کو چند ابواب میں اور ابواب کو چند فصلوں میں تقسیم کیا ہے۔ کتاب کے آخر میں ایک فصل امامؑ کے دیدہ زیب کلام پر مشتمل ہے۔ البتہ وہ کلماتِ قصار جن میں موعظہ، حکمت، تمثیلات آداب وغیرہ شامل تھے، نہ تو طولانی خطبات اور نہ ہی وسیع مکتوبات۔ کچھ دوستوں نے اس کو دیدہ زیب اور مختلف حوالوں سے تعجب آمیز سمجھا۔ اور مجھ سے

خواہش ظاہر کی کہ میں کوئی ایسی کتاب تالیف کروں جو امیر المومنین علیہ السلام کے مختلف خطبات، مکتوبات، مواعظ اور آداب پر مشتمل ہو، کیوں کہ ایسی کتاب فصاحت و بلاغت کا شاہکار ثابت ہوگی، جس میں عربی ادب کے جوہر نیز دینی اور دنیاوی معاملات پر ایسے درخشاں نکات ہوں، جو کسی کتاب میں تالیف نہیں ہوئے ہوں۔ کیوں کہ امیر المومنینؑ کے علاوہ کسی اور کے کلام میں اتنی وسعت نہیں ہوسکتی۔ آپ کی شخصیت فصاحت کا سرچشمہ اور بلاغت کی ولادت گاہ ہے۔ بلاغت کے اسرار آپ کے وسیلے سے آشکار ہوئے اور اس کے اصول وضوابط آپ ہی نے مرتب کیے ہیں۔ ہر مقرر اور خطیب نے آپ کی اقتدا کی اور واعظوں نے آپ کے کلام سے امداد طلب کی ہے۔ اسی بنا پر آپ ہمیشہ آگے ہیں اور باقی سارے پیچھے، آپ مقدم ہیں اور لوگ آپ سے مؤخر، کیوں کہ آپ کا کلام ایک ایسا کلام ہے کہ جس میں علمِ الٰہی کے آثار اور کلامِ رسولؐ کی خوشبو پائی جاتی ہے۔

میں نے ان دوستوں کی دعوت کو قبول کرتے ہوئے کام کا آغاز اس یقین کے ساتھ کیا کہ اس کے معنوی فوائد بہت زیادہ ہیں اور عنقریب یہ کتاب چھا جائے گی اور اس کا اجر میرے لیے ذخیرۂ آخرت ہوگا۔ میرا یہ مقصد بھی تھا کہ دیگر تمام فضائل کے ساتھ امیر المومنینؑ کی شخصیت کو اس حوالے سے بھی بیان کیا جائے کہ آپؑ وہ واحد شخصیت ہیں کہ گزشتہ لوگوں میں سے صرف آپؑ کا کلام باقی ہے، آپؑ کے فرمودات فصاحت و بلاغت کی آخری سرحد کو چھو رہے ہیں۔ آپؑ کا کلام ایک ایسا گہرا سمندر ہے، جس کی تہہ تک کسی فصیح وبلیغ انسان کا کلام بھی نہیں اتر سکتا۔ امامؑ کا کلام ہمارے لیے سرمایہ افتخار ہے۔ اس حقیقت کو بیان کرنے کے لیے میں معروف شاعر فرزدق کے قول کو نقل کر رہا ہوں کہ جو اپنے آباء واجداد پر فخر ومباہات کرتے ہوئے جریر نامی شخص سے یوں کہتا ہے

"أُولٰئِكَ آبَائِي فَجِئْنِي بِمِثْلِهِمْ إِذَا جَمَعَتْنَا يَا جَرِيرُ الْمَجَامِعُ"

"فضیلتیں مرے اجداد کی بیاں کرنا جریر، رُتبے سرِ بزم تُو عیاں کرنا اے جریر! وہ میرے آباء واجداد تھے، اگر ممکن ہو تو کسی اجتماع کے موقع پر ایسے اپنے آباء واجداد کا بھی ذکر کرنا۔"

میں نے دیکھا کہ امامؑ کے فرمودات کے تین بنیادی محور ہیں۔ اوّل خطبات اور اوامر، دوم مکتوبات و رسائل، سوم مواعظ اور حکمت آمیز اقوال۔ اسی بنا پر (توفیق الٰہی کے ساتھ) عزم وارادہ کیا کہ پہلے دیدہ زیب خطبات، پھر جاذبِ نظر مکتوبات، اس کے بعد حکمت آمیز کلماتِ قصار کا انتخاب کیا جائے۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے ایک باب قرار دیا اور ان کے لیے مخصوص صفحات قرار دیے تاکہ آئندہ بھی اگر کوئی کلام ہاتھ آئے، تو اسے اس باب میں اضافہ کردوں اور جب بھی کوئی ایسا کلام جس کا تعلق مناظرے یا کسی سوال کے جواب سے تھا یا کسی اور حوالے سے تھا، ہاتھ آیا اور وہ ان مذکورہ تین اقسام کلام اور ابواب سے نہیں ہوتا تھا، تو اسے ایسے باب میں رکھ دیا، جو زیادہ مناسب تھا، کہ اس میں رکھا جائے۔

لہٰذا بعض جگہ غیر منظم اور غیر مرتّب سا محسوس ہوتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے نزدیک حضرتؑ کے عظیم جملوں کو جمع کرنا تھا ان میں ربط برقرار رکھنا میرا ہدف نہیں تھا۔ امام علیؑ کا مقام ایسا تعجب خیز اور بے نظیر ہے کہ اگر کسی نے آپؑ کے کلام میں موجود زہد پر غور و فکر کرنا شروع کیا (البتہ وہ یہ نہ جانتا ہو کہ یہ کلام کہنے والا وہ عظیم انسان ہے، جس کے سامنے سب سرِ تسلیم خم کرتے ہیں) تو یقیناً وہ یہ گمان کرے گا کہ کلام ایسے زاہد کا ہے جس نے زہد کی وادی کے علاوہ اور عبادتِ پروردگار کے علاوہ کوئی کام نہیں کیا اور اسے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ شخص معاشرے سے دور گوشۂ خلوت، کسی پہاڑ کے دامن میں رہتا ہے۔ جو اپنی آواز کے علاوہ کسی آواز کو نہیں سنتا۔ وہ دوسروں کو نہیں دیکھتا اور ہمیشہ مشغولِ عبادت ہے۔ وہ یہ یقین نہیں کر سکتا کہ یہ کلام اُس کا ہے جو میدانِ جنگ میں تلوار اٹھاتا ہے اور دشمن کے لشکر سے واپس لوٹتے وقت اس کی تلوار سے خون ٹپکتا تھا اور وہ اس حال میں بھی زاہدوں کا سردار اور صالحین سے بلند تر ہے۔

یہ حضرتؑ کے فضائل میں سے ہے کہ ان کے اندر متضاد صفات جمع تھیں یعنی متضاد صفات کا ایک جگہ جمع ہونا آپؑ ہی کا خاصہ تھا، بارہا ایسا ہوا کہ میں دوستوں سے اس پہلو کا تذکرہ کرتا تھا جو خود غور و خوض کے لیے عظیم پہلو ہے۔ یہ نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ بعض اوقات کلام کے درمیان الفاظ اور مفاہیم کی تکرار ہوئی ہے اور یہ میری مجبوری تھی کیونکہ امامؑ کے کلام سے مربوط روایات میں شدید اختلاف ہے۔ کبھی ایک کلام کو روایت میں پایا تو اس کو اسی طریقے سے نقل کر دیا اور اس میں پھر دوسری روایت ملی تو وہ پہلی روایت کی طرح نہیں تھی یا اس میں مطالب زیادہ ہونے کی وجہ سے یا پھر دیدہ زیب الفاظ کی وجہ سے اس کو دوبارہ ذکر کرنا ضروری تھا۔

اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے طویل مدّت کام کرنے کی وجہ سے کچھ حصہ بھول کر تکرار کر دیا ہو البتہ عمداً ایسا نہیں ہوا ہے۔ اس کے باوجود میں کبھی بھی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں نے امامؑ کے تمام کلام کا احاطہ کر لیا ہے۔ یعنی ایسا دعویٰ نہیں ہو سکتا کہ حضرتؑ کا کوئی کلام میرے ہاتھ سے نہیں رہا، بلکہ عین ممکن ہے جو جمع کر دیا ہے اس سے زیادہ وہ کلام ہو جس تک میری رسائی نہیں ہو سکی، کیوں کہ میری ذمّے داری ان گم شدہ گوہروں کی تلاش ہے اور خدا سے دعا ہے کہ وہ اس راہ میں رہنمائی عطا کرے۔

کتاب پایۂ تکمیل تک پہنچی تو سوچا اس کتاب کا نام نہج البلاغہ رکھا جائے، کیونکہ یہ کتاب بلاغت کے دروازوں کو کھول دیتی ہے اور اس کی آرزو کو پورا کر دیتی ہے۔ یہ کتاب مفکرین، علماء اور طالب علم سب کی ضرورت ہے۔ اس کتاب میں ادیب اور زاہد دونوں کی تسکین مزاج پائی جاتی ہے امامؑ کے کلام میں تعجب کی بات یہ ہے کہ توحید، عدل اور مخلوق سے خدا کی مشابہت کا انکار وغیرہ وہ موضوعات ہیں، جن پر بات کرنا مشکل ہے، مگر ہر تشنۂ معرفت اور ہر بیمار کو شفاء اور زنگ آلود دلوں کو

صاف کرنے کے لیے یہ کلام معجزہ ہے۔ میں خداوندِ عالم سے لغزشوں سے بچنے کے لیے توفیق چاہتا ہوں۔ وہ مجھے اس راہ میں ہمّت وطاقت عطا کرے اور زبان کی خطا سے پہلے فکر کی خطا اور خطائے قدم سے پہلے خطائے زبان سے پناہ مانگتا ہوں۔ وہی میرے لیے کافی ہے اور میرے لیے بہترین محافظ اور مددگار ہے۔

❁❁❁❁❁

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَبِہٖ نَسۡتَعِیۡنُ

پہلا خطبہ

یہ خطبہ نہج البلاغہ کے اہم ترین خطبات میں سے ایک ہے،[۱] جو اس کتاب کے آغاز میں ہے اور مرحوم سیّد رضیؒ کے حسنِ انتخاب کی علامات میں سے ایک علامت ہے۔ یہ خطبہ اسلامی تصوّر کائنات کا مکمل نصاب ہے جس میں خداوند متعال کی صفاتِ کمال وجلال اور اَسرار ورموز سے آغاز ہوتا ہے اور پھر عمومی طور پر کائنات کی خلقت، آسمان وزمین کی خلقت، فرشتوں کی خلقت، پھر حضرت آدمؑ کی خلقت، فرشتوں کے سجدے کی داستان، ابلیس کی مخالفت اور زمین پر حضرت آدمؑ کی آمد کا تذکرہ ہے۔ خطبے کے دوران پیغمبروں کی بعثت اور اس کا فلسفہ، آخر الامر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت، قرآن مجید کی عظمت اور سنّت رسولؐ کی اہمیت پر گفتگو کی ہے، اسلامی دستورات میں سے فروعِ دین اور اس میں سے بھی حج کو ایک عظیم الٰہی فریضے کے طور پر بیان کیا ہے۔ اس خطبے کے ذریعے سے ہمارے لیے اسلام کے اہم ترین مسائل کے بارے میں ایک جامع تصوّر اور بہت سے اہم مسائل کا حل بیان کیا گیا ہے۔ ایک اعتبار سے یہ خطبہ قرآن مجید میں موجود سورۂ فاتحہ کی مانند ہے۔ جس میں نہج البلاغہ کے تمام مندرجات کی ایک فہرست موجود ہے۔ اس خطبے میں تمام خطبات، مکتوبات اور کلماتِ قصار کی ایک مختصر تجلی پائی جاتی ہے۔ ہم نے خطبے کو پندرہ حصوں میں تقسیم کیا ہے پھر ہر حصے کی وضاحت اور تشریح بیان کی ہے اور آخر میں حاصلِ کلام کو بیان کیا ہے۔

پہلا حصّہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَمِنۡ خُطۡبَۃٍ لَہٗ عَلَیۡہِ السَّلَامُ

"یَذۡکُرُ فِیۡہَا ابۡتِدَاءَ خَلۡقِ السَّمَاءِ وَ الۡاَرۡضِ وَ خَلۡقَ آدَمَ وَ فِیۡہَا ذِکۡرُ الۡحَجِّ وَ تَحۡتَوِیۡ عَلٰی حَمۡدِ اللّٰہِ وَ خَلۡقِ الۡعَالَمِ وَ خَلۡقِ الۡمَلَائِکَۃِ وَ اخۡتِیَارِ الۡاَنۡبِیَآءِ وَ مَبۡعَثِ النَّبِیِّ وَ الۡقُرۡآنِ وَ الۡاَحۡکَامِ الشَّرۡعِیَّۃِ"

''جس میں آسمان وزمین کی خلقت کی ابتدا اور خلقت آدم علیہ السلام کے تذکرے کے ساتھ حج بیت اللہ کی عظمت کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ یہ خطبہ حمد وثنائے پروردگار، خلقتِ عالم، تخلیقِ ملائکہؑ، انتخاب انبیاء ؑ، بعثتِ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، عظمت قرآن اور مختلف احکامِ شرعیہ پر مشتمل ہے۔''

"اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ لَا یَبۡلُغُ مِدۡحَتَہُ الۡقَائِلُوۡنَ، وَ لَا یُحۡصِیۡ نَعۡمَاءَہُ الۡعَادُّوۡنَ، وَ لَا یُؤَدِّیۡ حَقَّہُ الۡمُجۡتَہِدُوۡنَ، الَّذِیۡ لَا یُدۡرِکُہُ بُعۡدُ الۡہِمَمِ، وَ لَا یَنَالُہُ غَوۡصُ الۡفِطَنِ، الَّذِیۡ لَیۡسَ لِصِفَتِہٖ حَدٌّ مَحۡدُوۡدٌ، وَ لَا نَعۡتٌ مَوۡجُوۡدٌ، وَ لَا وَقۡتٌ مَعۡدُوۡدٌ وَ لَا اَجَلٌ مَمۡدُوۡدٌ، فَطَرَ الۡخَلَائِقَ بِقُدۡرَتِہٖ، وَنَشَرَ الرِّیَاحَ بِرَحۡمَتِہٖ، وَ وَتَّدَ بِالصُّخُوۡرِ مَیَدَانَ اَرۡضِہٖ"

''ساری تعریف اُس اللہ کے لیے ہے، جس کی مدحت میں بولنے والوں کے تکلم کی رسائی نہیں ہے اور اس کی نعمتوں کو گننے والے شمار نہیں کر سکتے ہیں۔ اس کے حق کی ادائیگی کی کوشش کرنے والے بھی ادا نہیں کر سکتے ہیں۔ نہ ہمتوں کی بلندیاں اس کا ادراک کر سکتی ہیں اور نہ ذہانتوں کی گہرائیاں اس کی تہہ تک جا سکتی ہیں۔ اس کی صفت ذات کے لیے نہ کوئی معین حد ہے نہ توصیفی کلمات، نہ مقررہ وقت ہے اور نہ آخری مدّت۔ اس نے تمام مخلوقات کو صرف اپنی قدرت کاملہ سے پیدا کیا ہے اور پھر اپنی رحمت ہی سے ہوائیں چلائی ہیں اور زمین کی حرکت کو پہاڑوں کی میخوں سے سنبھال کر رکھا ہے۔''

شرح وتفسیر

اُس کی ذات کی بلندی تک فکر کی پرواز ممکن نہیں

اس خطبے میں اگر اجمالی طور پر دیکھا جائے تو امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے پروردگارِ عالم کے بارہ اوصاف کو منظم اور خوبصورت طریقے سے بیان فرمایا ہے۔

پہلے مرحلے میں: یہ معلوم ہوتا ہے کس طرح بندے خداوند عالم کی مدح وثنا اور شکر بجالانے سے عاجز ہیں۔اس میں تین اوصاف کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

دوسرے مرحلے میں: اس حقیقت کو بیان کرتے ہیں کہ اُس کی مقدس ذات ہر حوالے سے لامحدود اور اس کی نعمتیں بے پناہ ہیں۔ ہم اُس کی ذات کو درک کرنے سے عاجز ہیں، نیز اس کے حق کو ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ اس مرحلے میں دو اوصاف کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

تیسرے مرحلے میں: اس بات کی طرف رہنمائی ہے کہ اُس کی ذاتِ پاک ہر اعتبار سے لامحدود اور اسی وجہ سے اس کی نعمتیں بھی بے حد وحساب ہیں اور اس بارے میں ہماری عاجزی کہ اسے درک نہیں کر سکتے اور اُس کے حق کو ادا نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مرحلے میں چار اوصاف کی طرف اشارہ ہے۔

چوتھے مرحلے میں: یہ خطبہ کائنات اور مخلوقات کی خلقت کی طرف پلٹتا ہے۔ گویا اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ اُس کی ذات کو صرف اسی طریقے سے پہچان سکتے ہیں اور یہ ہماری سب سے بڑی اور آخری کوشش ہے۔اس حصّے میں تین اوصاف کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ یہ خطبہ اس بات کا گواہ ہے کہ عالم بشریت کے اس عظیم معلّم نے اپنے خطبے میں ایسی تعبیرات کا انتخاب فرمایا ہے جو بالکل طے شدہ اور ایک خاص نظم وضبط کے ساتھ ہیں۔اس اجمالی خاکے کے بعد مندرجہ بالا بارہ اوصاف کو بیان کرنے کے لیے خطبے پر دوبارہ غور کرتے ہیں۔

خدا کی پہلی صفت

امامؑ نے گفتگو کا آغاز حمد الٰہی سے کرتے ہیں اور اس کے مقابلے پر عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِی لَا یَبْلُغُ مِدْحَتَهُ الْقَائِلُوْنَ"[۱]

''حمد وتعریف اُس اللہ کے لیے، جس کی مدحت میں بولنے والوں کے تکلم کی رسائی نہیں ہے۔''

واضح رہے کہ خداوند متعال کے اوصافِ کمال و جمال حدودِ عقل سے بالاتر ہیں۔ جو کچھ انسان اور فرشتے اس کی حمد و ثناء میں کہتے ہیں، ان کی اپنی استعدادِ معرفت و شناختِ پروردگار کے مطابق ہوتا ہے ورنہ اُس کی ذات بے مثال ہے اور کمالات لامحدود۔ جب خود پیغمبر ختمی مرتبتؐ جو پیغمبرانِ الٰہی میں سب سے بلند مرتبے پر ہیں، خداوند متعال کی معرفت سے عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ"[۲]

خدایا! ہم تیری معرفت نہیں رکھتے، جس طرح معرفت رکھنے کا حق ہے، تو دوسرے لوگ کس طرح اُس کی معرفت کے دعویدار ہو سکتے ہیں؟ اور جب انسان اُس کی معرفت سے عاجز ہو تو کس طرح اُس کی حمد وثنا بجالا سکتا ہے؟ بنابرایں سب سے برتر حمد وہی ہے جسے مولاؑ نے بیان فرمایا ہے۔ یعنی اُس کی حمد وثنا کرنے سے عاجزی کا اظہار۔ اس اعتراف کے ساتھ کہ کوئی بھی قاری حمد وثنا کی بلندی تک نہیں پہنچ سکتا۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث ہے کہ خداوند عالم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی بھیجی، اے موسیٰ! میرے شکر کے حق کو ادا کرو۔ عرض کی، پروردگار! کس طرح تیرے شکر کا حق بجالاؤں؟ کیوں کہ جب تیرا شکر بجالاتا ہوں تو یہ خود بھی ایک نعمت ہے، جو تُو نے مجھے عطا کی ہے (شکر کرنے کی توفیق خود ایک نئی نعمت ہے جس سے تو نے نوازا ہے، اس کے لیے ایک اور شکر ادا کرنا ضروری ہے) فرمایا:

"یَا مُوْسیٰ اَلْآنَ شَکَرْتَنِیْ حِیْنَ عَلِمْتَ اَنَّ ذَالِكَ مِنِّیْ۔۔۔۔"[۳]

''اے موسیٰؑ! تم نے اب میرا شکر ادا کیا ہے کہ جب تم نے یہ جان لیا کہ یہ بھی میری جانب سے ہے اور تم شکر

---

[۱] حمد، مدح اور شکر کے الفاظ کی توضیح میں علمائے لغت، مفسرین قرآن اور شارحین نہج البلاغہ میں کافی فرق ہے۔ لیکن ان کے درمیان مشہور یہ ہے کہ حمد ہر قسم کی وہ تعریف ہے جو نیک اور اچھے کاموں کے مقابل اپنے اختیار سے کی جاتی ہے۔ جبکہ مدح کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس کی تعریف میں اختیاری اور غیر اختیاری تمام کیفیات جیسے خوبصورتی کی مدح شامل ہیں، لیکن شکر اس جگہ ہے جہاں کسی کو کوئی نعمت میسر ہو تو وہ اپنے رب کا شکر ادا کرے۔ (اس حوالے سے بہتر معلومات کے لیے تفسیر مجمع البحرین لسان العرب سے رجوع کیا جائے۔ مفردات، شرح ابنِ میثم، شرح علّامہ خوئی) قرآن اور نہج البلاغہ کے بعض مفسرین منجملہ زمخشری نے کشاف میں اور ابن ابی الحدید نے اپنی شرح میں حمد اور مدح کو ایک ہی شمار کیا ہے۔ ان دونوں کے درمیان فرق کے قائل نہیں ہوئے ہیں۔ البتہ پہلی تفسیر صحیح دکھائی دیتی ہے۔

[۲] مرحوم علامہ مجلسیؒ، اپنے مفصل بیانات میں بحار الانوار کی احادیث کی توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں، کہ محقق طوسیؒ نے پیغمبر اکرمؐ سے بغیر سند کے نقل کیا ہے، "مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ وَمَا عَرَّفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ"۔ بحار الانوار، ج ۶۸، ص ۲۳۔

[۳] اصولِ کافی، ج ۲، ص ۹۸، حدیث ۲۷

بجالانے سے عاجز ہو۔''

ایک اعتبار سے جب انسان کہتا ہے ''الحمدللہ'' تمام تر حمد وتعریف اللہ کے لیے ہے، پھر حمد وتعریف کا کوئی مرتبہ باقی نہیں بچتا ہے مگر یہ کہ تمام تر حمد وتعریف اُسی کے لیے مختص ہوجاتی ہے۔ اسی لیے حدیث میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام مسجد سے باہر تشریف لائے تو دیکھا کہ آپؑ کی سواری گم ہوگئی ہے آپ نے فرمایا، اگر خدا نے اسے مجھے واپس لوٹادیا تو اس کے شکر کا حق ادا کروں گا، کچھ دیر بعد امامؑ کی سواری واپس آگئی۔ اس موقع پر فرمایا: ''الحمدللہ'' ایک شخص نے کہا، آپؑ پر قربان ہوجاؤں، کیا آپؑ نے نہیں فرمایا تھا کہ میں خدا کے شکر کا حق ادا کروں گا۔ امامؑ نے فرمایا۔ کیا تم نے نہیں سنا کہ میں نے ''الحمدللہ'' کہا ہے۔ [۱]

خدا کی دوسری صفت

''وَلَا يُحْصِيْ نَعْمَائَهُ الْعَادُّوْنَ''

حساب کرنے والے ماہرین کبھی بھی اُس کی نعمتوں کو شمار نہیں کرسکتے، کیوں کہ خداوند متعال کی مادّی، معنوی، ظاہری، باطنی، انفرادی اور اجتماعی نعمتیں اتنی زیادہ ہیں، جو شمار نہیں کی جاسکتیں۔ انسان کے جسم میں اوسطاً، ایک کروڑ ارب خلیے (سیلز) ہیں اور ان میں سے ہر ایک زندہ وجود رکھتا ہے یعنی ایک انتہائی پیچیدہ نظام کے تحت ان میں سے ہر ایک نعمتِ الٰہی ہے، جن کو دس ہزار سال میں بھی شمار کرنا ممکن نہیں ہے۔

پس جب انسان اپنے اس مختصر وجود میں پوشیدہ نعمتوں کو شمار نہیں کرسکتا، تو یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ وہ بیرونی نعمتوں کو جو خواہ مادّی شکل میں ہوں یا معنوی شکل میں، شمار کرسکے گا۔ پھر اصولاً ہم اُس کی تمام نعمتوں سے آگاہ بھی نہیں ہیں کہ شمار کرنے کی کوشش کرسکیں۔ اُس کی بے شمار نعمتیں ایسی ہیں کہ جو ہمیں ہمیشہ گھیرے رہتی ہیں اور ہم سے کبھی زائل نہیں ہوتیں، اسی لیے ہم ان سے بے خبر رہتے ہیں (واضح رہے کہ کسی نعمت کا احساس اس کے ختم ہونے کے بعد ہوتا ہے) اس سے بڑھ کر اہم بات یہ ہے کہ جیسے جیسے انسانی علم ودانش کے دامن میں وسعت ہورہی ہے خداوند متعال کی نئی نئی نعمتوں کا انکشاف ہورہا ہے یہی وہ چیزیں ہیں جو مولاؑ کے اس قول کی تصدیق کرتی ہیں کہ: ''حساب کرنے والے اس کی نعمتوں کا شمار کرنے پر قادر نہیں۔'' جملہ ممکن ہے کہ سابقہ جملے کی علّت کے طور پر بیان کیا گیا ہو، یعنی جب اُس کی نعمتوں کا شمار ہی ممکن نہیں تو اس کی مدح وستائش کا حق کیسے ادا کیا جاسکتا ہے۔ افسوس کچھ بے خبر، ستمگر، غاصبوں نے اُس کی بہت سی نعمتوں کو غصب کر رکھا ہے یا

---

[۱] اصولِ کافی، ج ۲، ص ۹۷، حدیث ۱۸

اِسراف وتبذِیر سے برباد کر کے مخلوقِ خدا کے ایک بڑے گروہ کو زحمت وتکالیف میں مبتلا کر دیا ہے، لیکن یہ اُس کی نعمتوں کے محدود ہونے کی ہرگز دلیل نہیں ہے۔

خدا کی تیسری صفت

"وَلَا يُؤَدِّيْ حَقَّهُ الْمُجْتَهِدُوْنَ"

اُس کے حق کو سعی وتلاش کرنے والے ادا نہیں کر سکتے ہیں (چاہے وہ جتنا خود کو مشکل میں ڈالیں) یہ جملہ درحقیقت پہلے جملے کا نتیجہ ہے۔ جب اُس کی نعمتوں کو شمار نہیں کر سکتے تو پھر کس طرح اس کے حق کو ادا کر سکتے ہیں۔ دوسری تعبیر میں، اُس کا حق اُس کی عظمت کے مطابق ہے، جبکہ شکر اور حمد، ہماری محدود طاقت اور توانائی کے مطابق ہے۔ اسی دلیل کی بنا پر یہ ہمارا شکر اس کا بدلہ نہیں ہے اور صرف عمل کے میدان میں اُس کی مدح وثنا سے عاجز نہیں ہیں بلکہ فکر وخیال کے میدان میں بھی اس کی ذات کو درک کرنے سے عاجز ہیں۔ اس دلیل کی بنیاد پر مولاؑ نے دو اوصاف کا اضافہ کیا ہے۔

"اَلَّذِيْ لَا يُدْرِكُهُ بُعْدُ الْهِمَمِ وَلَا يَنَالُهُ غَوْصُ الْفِطَنِ"[1]

''وہ خدا جس کی ذات کی گہرائی کو بلند افکار اور دور اندیش افراد درک نہیں کر سکتے ہیں؛ علم ودانش کے دریا میں غوطہ زن انسان بھی اُس ہستی کے کمال تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔''

بعد الهمم اور **غوص الفطن** کی تعبیر گویا اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اگر بلند افکار ذاتِ الٰہی سے عالمِ مادہ وخاکی کی جانب محوِ حرکت ہوں قوسِ صعودی (عالمِ مادّہ سے اللہ کی جانب) میں اور مضبوط فکر واندیشہ افراد قوسِ نزولی (اللہ سے عالمِ مادّہ کی جانب) میں سفر کریں تو ان میں سے کوئی بھی کسی مقصد تک پہنچ نہیں سکتا اور اُس کی ذات کو درک کرنے سے عاجز اور ناتواں ہیں۔ پھر امامؑ نے اس دلیل کو بیان کیا کہ انسان کس طرح اُس کی ذات کی گہرائی کو درک کرنے سے عاجز ہے۔ فرمایا:

---

[1] "همم" ہمّت کی جمع ہے۔ مقائیس اللغۃ کے مطابق پگھل جانا، جاری ہونا، اور حرکت کرنے کے معنی میں ہے۔ غم واندوہ کو اسی وجہ سے "ہمّ" کہا گیا ہے جس سے انسان کا جسم و بدن پگھل جاتا ہے۔ پھر اہمیت رکھنے والی ہر بات جو انسان کی فکر وخیال کو مشغول رکھتی ہو، اس پر ھم اور ہمت کا اطلاق ہوا ہے۔ (مفردات میں بھی اس طرح کا بیان ہے) "غوص" پانی میں ڈوب جانا یا پھر اہم کام میں وارد ہونے کو کہا گیا ہے۔ "فطن" فطنہ کی جمع ہے فتنہ کے وزن پر۔ لسان العرب کے مطابق فہم، استعداد اور صلاحیت کے معنیٰ میں ہے۔

"اَلَّذِیْ لَیْسَ لِصِفَتِہٖ حَدٌّ مَحْدُوْدٌ، وَلَا نَعْتٌ[۱] مَوْجُوْدٌ، وَلَا وَقْتٌ مَعْدُوْدٌ وَلَا اَجَلٌ[۲] مَمْدُوْدٌ"

''وہ ایسی ہستی ہے جس کی صفات کے لیے کوئی سرحد نہیں ہے؛ اُس کے لیے توصیفی الفاظ ہیں، نہ اس کی ابتدا کے لیے وقت ہے نہ اس کی کوئی مدت ہے۔'' یعنی یہ کس طرح ممکن ہے کہ اُس کی ذات کی معرفت حاصل کرسکیں جبکہ ہماری فکر بلکہ ہماری تمام ہستی محدود ہے اور محدود اشیاء کے علاوہ اشیاء کا ادراک نہیں کرسکتی جبکہ ذاتِ باری تعالیٰ ہر طریقے سے لامحدود ہے اور اس کی صفات بے کراں، ازل وابد اس کی گرفت میں ہیں۔ نہ اُس کی کوئی حد ہے نہ ایسی صفت جس کو درک کیا جاسکے نہ اُس کا آغاز ہے نہ انجام، اُس کی ذات ہی نہیں، بلکہ اُس کی صفات بھی لامحدود ہیں۔

اُس کا علم لامحدود اور قدرت بے پایاں ہے، بالکل اسی طرح جس طرح اُس کی ذات لامحدود ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ ہستی مطلق ہے اور اس کے لیے کوئی قید اور شرط نہیں ہے۔ اس لیے کہ اگر اس کے لیے کوئی قید یا حد مقرر کردی جائے تو وہ ذات ''مرکب'' ہوجائے گی اور ہر ''مرکب'' وجود ممکن الوجود ہوتا ہے واجب الوجود نہیں ہوسکتا۔ اس بنا پر واجب الوجود ذات ہر لحاظ سے لامحدود ہوتی ہے اور اسی دلیل کی بنا پر یکتا و یگانہ اور بے مثل ہوتی ہے، کیونکہ دو لامحدود ذاتوں کا ہونا ایک وقت میں ناممکن ہے، کیونکہ دوئی کی صورت میں دونوں کی محدودیت لازم ہوجاتی ہے ہر ایک دوسرے کے وجود کی نفی کرتا ہے۔ (غور کیجیے)

گزشتہ جملے میں خدا کی صفاتِ جمال وجلال (صفاتِ ثبوتی اور سلبی) کو بیان کرنے کے بعد پروردگارِ عالم کے فعل کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"فَطَرَ[۳] الْخَلَائِقَ بِقُدْرَتِہٖ، وَنَشَرَ الرِّیَاحَ بِرَحْمَتِہٖ، وَوَتَّدَ[۴] بِالصُّخُوْرِ[۵] مَیَدَانَ[۶] اَرْضِہٖ"

---

[۱] ''نعت''، خلیل ابن احمد کے بقول کسی چیز کی نیک صفات کے ذریعے توصیف بیان کرنا، جب کہ وصف نیکی اور بدی دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

[۲] اجل: یعنی کسی چیز کا آخر یا آخری انجام چاہے وہ انسان کی عمر کے بارے میں ہو یا کسی اور چیز کے لیے جیسے وعدہ پورا کرنے یا قرض ادا کرنے کا وقت قریب ہونے کے معنی میں ہے۔

[۳] فَطَرَ مادّہ فَطر سے بروزن۔ سطر ہے، راغب مفردات میں کہتے ہیں کہ لمبائی میں کسی چیز کو شگافتہ کرنا ہے۔ روزے میں وقت مقررہ پر کھانا کھانے کو افطار کہا جاتا ہے، کیونکہ روزے کی حالت اس سے شگافتہ ہوجاتی ہے۔ اور یہ ایجاد و ابداع اور تخلیق کے معنی میں آیا ہے، گویا عدم کے پردے کو چاک کرکے اسے وجود بخشا ہے۔

[۴] وَتَّدَ، وَتِد کے مادّے سے وَقْت کے وزن پر ہے یعنی کسی چیز کا ثابت کرنا جیسے کیل (میخ) کسی چیز کو مضبوط کردیتی ہے اور اسے روک دیتی ہے البتہ کبھی یہ وَقْت کے وزن پر آیا ہے اور کبھی وَتَدْ، سَبَدْ کے وزن پر آیا ہے۔

[۵] صُخُور، صَخْرہ کی جمع ہے، لسان العرب کے مطابق سخت چٹان کو کہتے ہیں۔

[۶] مَیَدان، مَیَدْ کے مادّے سے ہے یعنی تحرک اور اضطراب، مَیَدان، ضَرَبان کے وزن پر اسی دھڑکن کے معنی میں ہے اور ''مَیَدان'' خَیَران کے وزن پر وسیع فضا کے معنیٰ میں ہے جس کی جمع میادین ہے۔

اپنی قدرت سے مخلوقات کو خلق کیا، ہواؤں کو اپنی رحمت سے متحرک کیا اور انھیں پھیلا دیا اور زمین کے اضطراب کو پہاڑوں کے ذریعہ دور کیا۔ مذکورہ بالا تعبیرات پر چند آیات قرآنی دلالت کرتی ہیں، جیسے "فَطَرَ الْخَلَائِقَ بِقُدْرَتِهِ"، آیت "فَاطِرَ السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضِ" کی طرف اشارہ ہے، جو قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں آئی ہے۔[1] "وَنَشَرَ الرِّيَاحَ بِرَحْمَتِهِ" اشارہ ہے اس آیت کی جانب:

"وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ"[2]

''وہ ایسا ہے، جس نے بارانِ رحمت سے پہلے بشارت دینے والی ہواؤں کو بھیجا۔''

اور "وَتَدَ بِالصُّخُوْرِ مَيَدَانَ اَرْضِهِ" اشارہ ہے اس آیت کی طرف:

"وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ"[3]

''زمین میں بلند و بالا پہاڑوں کو نصب کر دیا ہے، تا کہ وہ تمہیں نہ لرزائے۔''

جیسا کہ ''فطر'' کے معنی میں کہا گیا ہے خلق کا ظلمانی، پردۂ عدم چاک کرنے سے مشابہ ہے، ایک ایسا پردہ جو منظم، مربوط اور ہر قسم کے شگاف سے خالی ہے، لیکن پروردگارِ عالم اپنی طاقت سے اس کو شگافتہ کر کے اس سے مخلوقات کو باہر بھیجتا ہے۔ اور یہ چیز اُس کی قدرت کے علاوہ ممکن نہیں ہے۔ جدید مفکرین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ محال ہے کہ ہم عدم سے کسی چیز کو وجود بخشیں۔ یا وجود سے وادیِ عدم کی طرف بھیجیں، جو چیز ہمارے پاس ہے وہ صرف موجودات کی شکل کو تبدیل کرنے کی حد تک ہے اور بس۔ "نَشَرَ" ہوائیں چلانے کو رحمت سے تعبیر کیا ہے، ہوا کی جاذبیت و لطافت کے ہمراہ اس کے مختلف آثار ہیں، مثلاً سوکھی زمینوں کی طرف بادلوں کی حرکت، پودوں کے درمیان پیوند کاری، کشتیوں کی حرکت، گرمی اور سردی میں درجۂ حرارت کو معتدل رکھنا، اور دیگر تمام فوائد کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ تعبیر بہت ہی مناسب ہے۔

لیکن اس مسئلے میں کہ ''وَتَدَ بِالصُّخُوْرِ'' پہاڑ اور چٹانیں زمین کو ہلنے سے روکتے ہیں، پچھلے زمانے کے مفکرین یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ زمین ساکن ہے اور اس کے لیے وضاحتیں بھی بیان کرتے تھے جو آج کل کے دور میں قابلِ قبول نہیں ہیں، بلکہ اس ضمن میں بہترین تفاسیر موجود ہیں، جو علمی حقائق کے ساتھ سازگار اور آیاتِ قرآنی کے ساتھ ہم آہنگ بھی ہیں، اس لیے کہ

---

[1] سورۂ یوسف: آیت ۱۰۱، سورۂ ابراہیم: آیت ۱۰، سورۂ فاطر: آیت ۱، وغیرہ۔

[2] سورۂ اعراف، آیت ۵۷

[3] سورۂ نحل، آیت ۱۵

(الف) پہاڑوں کا سطح زمین پر ہونا سبب بنتا ہے کہ ''مدّ و جزر'' جو چاند و سورج کے جاذبے کا نتیجہ ہے، وہ خشکی پر کم سے کم ہو، اگر سطحِ زمین کو نرم خاک نے پُر کر دیا ہوتا تو لامحالہ ''مدّ و جزر'' دریاؤں کی طرح زمین کو پُر کر دیتا اور یہ قابل سکونت نہ رہ پاتی۔

(ب) زمین کے نیچے پہاڑوں کی جڑیں آپس میں ملی ہوئی ہیں جنہوں نے ایک زِرہ (جو فوجی حالت جنگ میں زیب تن کرتے ہیں) کی مانند زمین کو حصار میں لے رکھا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتیں تو اندرونی گیسوں کی وجہ سے زمین کے مختلف گوشے حرکت میں ہوتے اور زمین میں ٹھہراؤ نہ ہوتا۔ اب بھی بعض اوقات جب زمین کے اندر موجود گیسوں کا تناؤ حد سے بڑھ جاتا ہے تو زمین پر زلزلہ آ جاتا ہے۔ اگر یہ پہاڑ نہ ہوتے تو یہ زلزلے مستقل شکل اختیار کر لیتے۔

(ج) زمین پر پہاڑوں کا وجود سائیکل کے پہیے میں موجود کمانیوں کی طرح ہوا کو متفرق و منتشر کر دیتا ہے۔ اگر سطح زمین صاف ہوتی تو ہوا کے مختلف حصّوں سے تصادم ہوتا جبکہ ایک طرف شدید طوفان اور دوسری جانب اس تصادم کی وجہ سے درجۂ حرارت میں اضافہ ہوتا، جس سے انسان کے لیے زندگی گزارنا مشکل ہو جاتا۔ الحاصل یہ کہ ''صخور'' یعنی پہاڑ ''میدان'' یعنی زمین کی نامنظم تحرکات کو کنٹرول کر لیتے ہیں، اس کے علاوہ پہاڑ انسان کے لیے پانی کا مخزن ہے۔

چنانچہ زیر زمین چشموں اور روئے زمین نہروں کا دارومدار انہی بلند و بالا پہاڑوں پر ہے۔ انسان کی زندگی میں ہواؤں اور پہاڑوں کے کردار کے ذکر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امیر المومنینؑ نے خلقت و آفرینش کی طرف اشارہ کرنے کے بعد خصوصی طور پر ان دو موضوعات پر توجّہ مرکوز فرمائی ہے۔

دوسرا حصّہ

''اَوَّلُ الدِّیْنِ مَعْرِفَتُہٗ، وَ کَمَالُ مَعْرِفَتِہِ التَّصْدِیْقُ بِہٖ وَ کَمَالُ التَّصْدِیْقِ بِہٖ تَوْحِیْدُہٗ وَ کَمَالُ تَوْحِیْدِہِ الْاِخْلَاصُ لَہٗ، وَ کَمَالُ الْاِخْلَاصِ لَہُ نَفْیُ الصِّفَاتِ عَنْہُ، لِشَھَادَۃِ کُلِّ صِفَۃٍ اَنَّھَا غَیْرُ الْمَوْصُوْفِ، وَ شَھَادَۃِ کُلِ مَوْصُوْفٍ اَنَّہٗ غَیْرُ الصِّفَۃِ فَمَنْ وَصَفَ اللّٰہَ سُبْحَانَہٗ فَقَدْ قَرَنَہٗ، وَ مَنْ قَرَنَہٗ فَقَدْ ثَنَّاہُ وَ مَنْ ثَنَّاہُ فَقَدْ جَزَّأَہٗ، وَ مَنْ جَزَّأَہٗ فَقَدْ جَھِلَہٗ، وَ مَنْ جَھِلَہٗ فَقَدْ اَشَارَ اِلَیْہِ. وَ مَنْ اَشَارَ اِلَیْہِ فَقَدْ حَدَّہٗ، وَ مَنْ حَدَّہٗ فَقَدْ عَدَّہٗ'' [۱]

''دین کی ابتداء اس کی معرفت سے ہے اور معرفت کا کمال اس کی تصدیق ہے۔ تصدیق کا کمال توحید کا اقرار ہے

---

[۱] مشکل الفاظ کے معنی آخر کتاب ''ضمیمہ'' میں ملاحظہ فرمائیں۔

اور توحید کا کمال اخلاص عقیدہ ہے اور اخلاص کا کمال زائد بر ذات صفات کی نفی ہے' کہ صفت کا مفہوم خود ہی گواہ ہے کہ وہ موصوف سے الگ کوئی شے ہے اور موصوف کا مفہوم ہی یہ ہے کہ وہ صفت سے جدا گانہ کوئی ذات ہے۔ پس جس نے اس کی توصیف کی تو گویا اس نے کسی کو خدا قرین قرار دیا اور جس نے کسی کو خدا کا قرین قرار دیا تو گویا وہ ذات الٰہی میں دوگانگی کا قائل ہوا اور جس نے خدا میں دوگانگی کا عقیدہ رکھا تو اس کا لازمی نتیجہ ذات الٰہی میں اجزاء کا تصور ہے اور ذات خدا میں اجزاء کا تصور جہالت ہے اور جو خدا کی ذات سے جاہل ہوگا وہ خدا کی طرف اشارہ کرے گا اور جس نے خدا کی طرف اشارہ کیا تو گویا اس نے خدا کو ایک خاص سمت میں محدود کر دیا اور جس نے محدود کر دیا، اس نے اسے گنتا شمار کر لیا (جو سراسر خلافِ توحید ذات ہے)۔''

شرح وتفسیر

توحید ذات وصفاتِ الٰہی

یہ مقام خود خدا شناسی کا ایک مکمل باب ہے۔ امیر المومنینؑ نے اس حصّے میں نہایت مختصر اور جامع عبارات کے ذریعے خداوندِ عالم کی ایسی تعریف کی ہے کہ جس کے آگے کوئی تعریف تصور نہیں کی جاسکتی۔ اور اگر توحید و خداشناسی کے حوالے سے تمام تر دُروس اور مضامین کو جمع کر لیں، تب بھی اس سے زیادہ وسیع درس نہ مل سکے گا۔ اس مقام پر آپؑ نے خداوندِ عالم کی معرفت اور پہچان کے لیے پانچ مراحل کا ذکر کیا ہے، جنہیں مختصراً یُوں بیان کیا جاسکتا ہے:

۱۔ مجمل اور ناقص شناخت ۲۔ تفصیلی شناخت ۳۔ مقامِ توحید ذات وصفات ۴۔ مقامِ اِخلاص ۵۔ مقامِ نفی تشبیہ۔

۱۔ ابتدا میں فرماتے ہیں:

''اَوَّلُ الدِّیْنِ مَعْرِفَتُہٗ''

''دین کا آغاز معرفت اور خداشناسی ہے۔''

بلاشبہ اس مقام پر دین کو عقائد، احکام و اعمال اور اخلاق کا مجموعہ بتایا گیا ہے، جس مجموعے کا آغاز و بنیاد معرفتِ الٰہی ہے۔ اس بنا پر شناخت خداوند عالم پہلا قدم بھی ہے اور اصول و فروعِ دین کے لیے سب سے اہم مرحلہ بھی، جس کے بغیر یہ ہرا بھرا درخت پھل دار نہیں ہوسکتا۔ بعض حضرات کا یہ گمان ہے کہ معرفتِ خدا سے پہلے دین کے بارے میں تحقیق و جستجو اور

اس کے بارے میں مطالعہ کی ضرورت ہے۔ایک بڑی غلطی ہے، کیونکہ دین کے بارے میں فحص وجستجو اگرچہ بنیادی ضرورت ہے مگر خداوند عالم کی شناخت دین کی پہلی بنیاد ہے، گویا تحقیق مقدّمہ ہے اور خداوند عالم کی شناخت مقدمے کا مقدمہ ہے۔[۱]

ظاہر ہے کہ اجمالی معرفت، انسان کی فطرت میں ہے، یہاں تک کہ اُس کے لیے تبلیغ کی ضرورت تھی، مگر انبیاء و مُرسلینؑ کی بعثت کا مقصد یہ ہے کہ اجمالی معرفت کو تفصیلی معرفت میں بدل ڈالیں اور اُس کی شاخ و برگ رُشد ونمو پائیں اور معرفت کے اس درخت کے اطراف میں اُگنے والی گھاس، پھوس کو جسے شرک آلودہ ہواؤں نے جنم دیا ہے، زائل کیا جاسکے۔

۲۔دوسرے مرحلے میں فرماتے ہیں:

"وَ کَمَالُ مَعْرِفَتِهِ التَّصْدِیْقُ بِهٖ"

''خدا کی معرفت اور شناخت کا کمال اُس کی پاک ذات کی تصدیق ہے۔''

البتہ تصدیق اور معرفت میں کیا فرق ہے؟ اس بارے میں مختلف تفاسیر موجود ہیں۔پہلی بات یہ ہے کہ یہاں معرفت سے مُراد فِطری شناخت ہے اور تصدیق سے مُراد علمی اور استدلالی شناخت ہے۔ یا یہ کہ معرفت سے مراد، اِجمالی معرفت وشناخت ہے اور تصدیق سے مراد تفصیلی معرفت وشناخت ہے، یا پھر معرفتِ خدا کی نسبت علم وآگاہی کی طرف اشارہ ہے۔جبکہ تصدیق، ایمان کی جانب اِشارہ ہے۔کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ علم، ایمان سے جدا ہے، کیونکہ یہ ممکن ہے کہ انسان کسی چیز پر یقین رکھتا ہو مگر اس چیز پر قلبی ایمان نہ رکھتا ہو، ایمان قلبی سے مراد اُس شے کے سامنے سرِ تسلیم خم ہونا اور دل کی گہرائی سے اُسے پہچاننا ہے۔ بزرگ علماء نے ان دونوں میں فرق کیا ہے، وہ ایک سادہ سی مثال دیتے ہیں کہ بہت سے لوگ کسی جنازے کے پاس ٹھہرنے سے خاص طور پر رات کے وقت وہ بھی خالی کمرے میں وحشت کھاتے ہیں۔جبکہ اُنہیں یقین ہے کہ وہ مر چکا ہے، مگر یہ علم ان کے قلب کی گہرائیوں میں نافذ نہیں ہوا اور یہ یقین جس کی وجہ سے انھیں وحشت ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ علم کسی بھی چیز کے بارے میں آگاہی رکھنا ہے، مگر ممکن ہے کہ یہ آگاہی اور معلومات صرف سرسری ہوں اور اُن کی گہرائیوں سے واقفیت نہ ہو اور انسان کی روح اور وجود میں داخل نہ ہوئی ہوں، مگر جس وقت یہ یقین روح کی گہرائی میں داخل ہوجائے اور یقین کے گہرے درجات تک پہنچ جائے اور پھر انسان کا دل بھی اس کا گواہ بن جائے تو اُسے

---

[۱] مشہور دانشور مرحوم ''مغنیہ'' نے نہج البلاغہ کی اپنی شرح ''فی ظلال نہج البلاغۃ'' میں اسے خدا کے اوامر ونواہی میں اطاعت کے معنیٰ میں لیا ہے۔اور شارح خوئی نے پہلے اسی مطلب کا انتخاب کیا ہے، اگر ان کی مراد اطاعت کے دونوں پہلو ہیں، جن میں اعتقادی امور بھی شامل ہوتے ہوں تو پھر صحیح ہے اور اگر صرف عملی امور کی ادائیگی مراد ہے، تو درج بالا اشکال یہاں پر بھی وارد ہوتا ہے۔

ایمان کہا جاتا ہے۔

۳۔تیسرے مرحلے میں آپؑ فرماتے ہیں:

"وَ کَمَالُ التَّصْدِیْقِ بِہٖ تَوْحِیْدُہٗ"

''اُس کی پاک ذات کی تصدیق کا کمال اُس کی توحید ہے۔''

بے شک اگر چہ انسان خدا کی تفصیلی معرفت بھی حاصل کر لے یا دوسرے الفاظ میں دلائل و بُرہان کے ساتھ اسے پہچان لے، پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ توحیدِ کامل کے درجے تک پہنچ گیا ہے۔توحیدِ کامل تو یہ ہے کہ اُس کی ذات کو ہر طرح کی نظیر، مثال یا شبیہ سے پاک اور مُنَزَّہ جانے، کیونکہ جو بھی اُس کے لیے کسی کو شبیہ یا اُس جیسا سمجھ لے، تو درحقیقت جس چیز کو اس نے پہچانا ہے وہ خدا تھا ہی نہیں، کیوں کہ خدا ایک لامحدود وجود ہے اور ہر چیز اور ہر موجود سے بے نیاز ہے۔ جو بھی شبیہ یا مانند رکھتا ہو یقیناً وہ محدود ہے، کیونکہ آپس میں ملتے جلتے ایک ہی طرح کے یہ دونوں وجود ایک دوسرے سے جدا ہیں اور مختلف کمالات رکھتے ہیں۔لہٰذا اُس کی پاک ذات کی تصدیق اُس وقت اپنے کمال کو پہنچے گی، جب انسان اُسے ایک، واحد، یگانہ اور بے مثال سمجھے، یہاں یگانہ و یکتا سے مراد تعداد میں یگانہ اور واحد ہونا نہیں ہے بلکہ یگانہ اور ایک ہونے سے مراد بے مثال و بے شبیہ و نظیر ہونا ہے۔

۴۔چوتھے مرحلے میں جو کہ اِخلاص کا مرحلہ ہے، فرماتے ہیں:

"وَ کَمَالُ تَوْحِیْدِہِ الْاِخْلَاصُ لَہٗ"

''اُس کی توحید کا کمال اُس کے لیے اِخلاص رکھنا ہے۔''

اخلاص کا لفظ خلوص سے آیا ہے جو کہ خالص کرنا، صاف ستھرا کرنا اور اُس کے غیر سے پاک کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔نہج البلاغہ کے مفسرین میں اس بات پر کافی بحث ہے کہ اس مقام پر اخلاص سے مراد کیا اخلاص عملی یا قلبی یا اعتقادی مراد ہے؟ اخلاصِ عملی سے مراد یہ ہے کہ جو شخص توحیدِ الٰہی انتہائی درجے کی معرفت رکھتا ہو تو یقیناً وہ صرف اُسی کی بندگی کرے گا اور اُس کے ہر کام اور ہر شے میں منظور و مقصود خدا کی ذات ہی ہوگی۔ یہ وہی بات ہے کہ جس پر فقہاء نے عبادت میں اِخلاص کے عنوان پر تکیہ کیا ہے۔شارح نہج البلاغہ خُوئی نے اس مذکورہ تفسیر کو ایک قول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ذکر کیا ہے، اگر چہ اُس کے قائل کا حوالہ نہیں دیا۔[1]

مگر یہ احتمال بہت بعید ہے، کیونکہ اِس جملے کے سیاق و سباق کے جملے بھی اعتقادی حوالے سے ہیں، لہٰذا مولاؑ کا یہ

---

[1] منہاجُ البراعۃ، جلد ۱، ص ۳۲۱، آقائی خوئی کے مطابق، صدرالدین شیرازی کا بھی ''شرحِ کافی'' میں یہی نظریہ ہے۔

جملہ بھی اعتقادی اور عقیدتی خلوص کے بارے میں ہے۔ مگر قلبی اخلاص کو ''شارح بحرانی ابنِ میثم نے'' زہد حقیقی کے معنی میں لیا ہے، یعنی اُس کا قلب ہر اعتبار سے صرف خدا کی جانب متوجّہ ہو اور اُس کے غیر کی جانب تصوّر بھی نہ کرے اور اللہ کے علاوہ کسی اور کا گمان بھی نہ لائے اور اس کے غیر کی جانب توجّہ بھی نہ کرے۔ [1] اگرچہ یہ مقام ایک بہت بلند و بالا مقام ہے مگر بعید ہے کہ مولاؑ کے اس جملے کا مقصد یہ ہو، بلکہ اس جملے کا واحد مفہوم یہ ہے کہ پروردگار کی نسبت اپنے عقیدے کو خالص بنانا اور اُسے ہر حوالے سے بے مثال، واحد اور شباہت سے منزّہ جاننا اور ترکیب کے اجزاء سے پاک و مبرّا ٹھہرانا ہے۔

۵۔ پانچویں جملے میں اِمامؑ اِس معنی کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں:

''وَ كَمَالُ الْإِخْلَاصِ لَهُ نَفْيُ الصِّفَاتِ عَنْهُ''

''اُس کے لیے خلوص رکھنے کا کمال یہ ہے کہ تمام صفاتِ ممکنات کی اس سے نفی کی جائے۔''

پچھلے مرحلے میں اِخلاص کی گفتگو میں اِجمالی طور پر اخلاص کی بات ہوئی، مگر اس مقام پر جبکہ کمال اِخلاص کے مرحلے کی گفتگو ہوئی ہے، تو یہ تفصیل کا مقام ہے اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ توحید میں اخلاص پیدا کرنے کے لیے مخلوقات کی تمام صفات کو اُس کی ذات سے نفی کرنا ہوگا۔ چاہے وہ ترکیبی اجزاء رکھنے کی صفت ہو یا اس کے علاوہ کوئی اور صفت۔ اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ عقل و نفس جیسے مجرد ممکنات بھی درحقیقت مُرکب ہیں (کم از کم وجود و ماہیت کی ترکیب کے حوالے سے یہاں تک کہ خود مجردات) یعنی مادّے سے اوپر کے موجودات بھی اِس ترکیب سے علیحدہ نہیں ہیں اور جہاں تک مادّی موجودات کی بات ہے، تو وہ سب کے سب ویسے ہی خارجی اجزاء کا مجموعہ ہیں۔ مگر پروردگار کی ذاتِ پاک نہ تو خارجی اجزاء رکھتی ہے نہ عقلی اجزاء رکھتی ہے۔ نہ خارج میں تجزیے کے قابل ہے اور نہ ہی ہمارے فہم و ادراک کے سانچے میں۔ جو بھی اس حقیقت کو نہ پہچانے اُس نے خالص توحید نہیں پائی اور اس جملے یعنی ''اُس کی توحید کا کمال صفات کا اُس سے نفی کرنا ہے'' سے مراد ہرگز یہ نہیں ہے کہ صفاتِ کمالیہ کی بھی نفی کی جائے، کیونکہ تمام کمالیہ صفات جن میں علم، قدرت، حیات وغیرہ شامل ہیں، یہ سب کی سب اُسی کی ہیں۔ یہاں وہ صفات مراد ہیں، جن سے ہمارا ہمیشہ کا واسطہ ہے، جنہیں ہم جانتے پہچانتے ہیں، یعنی مخلوقات کی صفات جو کہ ہر طرف سے نقص سے بھرپور ہوا کرتی ہیں۔ اور دُرست ہے کہ مخلوقات علم و قدرت رکھتی ہیں۔ مگر ان کا علم و قدرت ناقص، محدود اور جہالت و ضعف و ناتوانی سے مخلوط ہے، جبکہ پروردگار کی ذاتِ پاک ایسے علم و قدرت سے منزّہ ہے۔ اس بات پر گواہ خود مولا علی علیہ السلام کا کلام ہے، جس میں آپؑ فرشتوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

''لَا يَتَوَهَّمُونَ رَبَّهُمْ بِالتَّصْوِيرِ وَلَا يُجْرُونَ عَلَيْهِ صِفَاتِ الْمَصْنُوعِينَ''

---

[1] شرح نہج البلاغہ، ج۱، ص ۱۲۲

''یہ کبھی بھی اپنے پروردگار کی تصویر کو قوتِ وہم کے سانچے سے نہیں بناتے اور کبھی اُس کے لیے مخلوقات کی صفات کے قائل نہیں ہوتے''، کیوں کہ مخلوقات کی صفات ہمیشہ اُن کی ذات سے الگ اور جدا ہوتی ہیں یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ ذات کے علاوہ کچھ صفات ہیں، چوں کہ انسان ایک شے ہے اور اُس کا علم اور قدرت ایک الگ شے ہے۔ اس طرح سے انسان کا وجود ان دو چیزوں سے مرکب ہے، جبکہ پروردگار کی تمام صفات عین ذات ہیں اور ان میں ترکیب کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ درحقیقت خدا شناسی اور توحید کی راہ میں سب سے بڑا خطرہ ''قیاس'' کے بھنور میں گر جانا ہے۔ یعنی صفاتِ خداوندی کو مخلوقات کی صفات سے ملا دینا یا اُن جیسا سمجھنا، جو کہ خود نُقص و کمی سے بھرپور ہیں۔ یا ذات کے علاوہ اس کی صفات پر عقیدہ رکھنا، جیسا کہ مسلمانوں کا ایک گروہ ''اشاعرہ'' اس میں گرفتار ہے۔ [1]

اسی بنا پر امامؑ اگلے جملے میں یوں فرماتے ہیں:

''لِشَهادَةِ كُلِّ صِفَةٍ اَنَّها غَيْرُ الْمَوْصُوفِ، وَشَهادَةِ كُلِّ مَوْصُوفٍ اَنَّهُ غَيْرُ الصِّفَةِ''

''کیونکہ صفاتِ ممکنات میں سے ہر صفت اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ وہ موصوف سے علیحدہ ایک چیز ہے اور ممکنات میں سے ہر مُوصوف اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ صفت کا غیر ہے۔''

یہ بات درحقیقت اس بات پر ایک روشن دلیل ہے کہ ذات کے علاوہ زائد صفتیں، زبانِ حال سے خود گواہی دیتی ہیں کہ وہ موصوف سے جُدا ہیں، اور ہر مُوصوف خود گواہی دیتا ہے کہ وہ صفت سے جُدا ہے۔ لہٰذا خدا کی صفات کو عین ذات جاننا چاہیے اور اس بات کا عقیدہ رکھنا چاہیے کہ خداوندِ عالم ایک ایسی ذات ہے، جو پورے کا پورا علم ہے، پوری قدرت ہے، ساری کی ساری حیات اور ازلیّت اور اَبدیّت ہے۔ اگرچہ ایسے معانی کا درک کرنا ہم جیسوں کے لیے بہت دُشوار ہے، جو مخلوقات کی صفات میں ہی دن رات جکڑے ہوئے ہیں۔ اور انسان کو ایک شے اور اُس کے علم و قدرت کو اُس کی ذات کے علاوہ ایک اور شے سمجھتے ہیں۔ (کیونکہ جب انسان ماں کے پیٹ سے جدا ہوا تو نہ علم رکھتا تھا اور نہ قدرت، اُس کے بعد وہ علم و قدرت رکھنے والا بنا)۔ پھر اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے آپؑ نہایت مختصر اور پُرمعنی جملے ارشاد فرماتے ہیں:

''فَمَنْ وَصَفَ اللّٰهَ سُبْحانَهُ فَقَدْ قَرَنَهُ، وَمَنْ قَرَنَهُ فَقَدْ ثَنّاهُ وَمَنْ ثَنّاهُ فَقَدْ جَزَّاءَهُ، وَمَنْ جَزَّاهُ

---

[1] اشاعرہ جو کہ ابوالحسن اشعری کے پیروکار ہیں، معانی کا اعتقاد رکھتے ہیں، اور معانی سے ان کی مراد عالمیت، غالبیت جیسی صفات کا مفہوم بھی خدا کی ذات کس طرح قدیم اور وازلی ہونا ہے، گویا یہ صفات غیر از ذاتِ الٰہی ہیں، لہٰذا یہ چند امرِ ازلی پر عقیدہ رکھتے ہیں، یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے، تعددِ قدما کے قائل ہیں، یعنی ایسا عقیدہ جو خالص توحید کے ساتھ کسی بھی صورت میں سازگار نہیں ہے، لہٰذا مکتبِ اہلِ بیتؑ کے پیروکار، ان ہستیوں کی تعلیمات کہ جو مذکورہ خطبے یا دیگر خطبوں اور فرامین میں آئی ہیں۔ کی روشنی میں (معانی) کو۔ جو کہ صفاتِ زائد بر ذات ہی کے مفہوم کو عیاں کرتی ہے۔ کو خدا کی ذات سے نفی کرتے ہیں۔ اور اسی طرح یہ جملہ کہ وہ ''بے شریک'' اور لا معانی کا جملہ اسی نکتے کی طرف اشارہ ہے۔

فَقَدْ جَهِلَهٗ"

''جو بھی خدائے سبحان کی مخلوقات کی سی صفات سے توصیف کرے، اُس نے اُسے دوسرے اُمور کا قرین ٹھہرایا ہے، اور جو بھی اُسے کسی دوسری شے کا قرین ٹھہرائے، اُس نے اُس کی ذات کے دُوگانہ ہونے کا اقرار کیا ہے، اور جس نے اس کے دوگانہ ہونے کا اقرار کیا اس نے گویا اس کے لیے اجزاء تصور کیے اور جو بھی اُس کے لیے اَجزاء کا تصور کرے اُس نے درحقیقت خدا کو پہچانا ہی نہیں۔''

درحقیقت امامؑ اِس بات پر زور دے رہے ہیں کہ مخلوقات کی جیسی صِفات کا خدا کے لیے ثابت ہونا اللہ کے مقدّس وجود میں ترکیب کا موجب بنتا ہے یعنی جیسے انسان اپنی ذات اور صفات کی مِلی ہوئی ترکیب پر مشتمل ہے، لیکن یہ بات اُس کے واجب الوجود ہونے سے سازگار نہیں ہے، کیونکہ ہر مُرکّب کو اپنے اجزاء کی ضرورت ہوتی ہے اور کسی بھی چیز کی ضرورت اور محتاجی وفقر ہونا، واجبُ الوُجود ہونے کے خلاف ہے۔ اس عبارت کی تشریح میں دو مزید تفسیریں کی گئی ہیں:

پہلی تفسیر: جب اُس کی صفات کو غیر ذات جانیں گے، تب بھی وہ مرکب ہوں گی، کیونکہ ذات اور صفات دو ہونے کے فرض میں کوئی جہت مشترک اور کوئی جہت امتیاز رکھتی ہے (کہ جو وجہ اشتراک اور وجہ امتیاز کہی جاتی ہے) کیونکہ یہ دونوں وجود اور ہستی میں ایک دوسرے کے شریک ہیں اور اُسی دوران ایک دوسرے سے جدا بھی ہیں۔ لہٰذا اُس کی ذات کو مذکورہ دو لحاظ سے مرکب جاننا ہوگا۔

دوسری تفسیر: ہم جانتے ہیں کہ ذاتِ الٰہی کے بارے میں وحدت سے مراد عَدَدی وحدت نہیں، بلکہ ذاتِ الٰہی کی وحدت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنی کوئی شبیہ، نظیر اور مانند نہیں رکھتا۔ اُصولی طور پر ایک ایسا وجود جس کی ہر جہت سے کوئی انتہا نہیں، اُس کی کوئی شبیہ یا مثال ہو یہ ناممکن ہے اور اگر ہم صفاتِ خدا کو اُس کی ذات کی طرح ازلی اور ابدی اور بے انتہا سمجھیں تو ہم نے گویا اُس کو محدود کر دیا اور اس کے لیے یہیں پر ہم نے خود ایک شبیہ اور مانند بنا دیا۔ (غور کیجیے)

مذکورہ گفتگو اسی معنی کی طرف رہنمائی کرتی ہے، جس میں امامؑ نے اخلاص کی تشریح فرمائی ہے: جس نے خدا کو مخلوق کی صفات سے قیاس کیا، اُس نے اُسے دوسری مخلوقات جیسا سمجھ لیا اور جس نے اُسے دوسری مخلوقات جیسا سمجھ لیا اُس نے اُس کے دوگانہ ہونے کا اقرار کیا یعنی صفات اور ذات کو اجزاء سے مرکب سمجھ لیا اور جس نے اُس کی ذات کو مرکب ٹھہرایا، اُس نے اُسے پہچانا ہی نہیں۔ کیونکہ اُس نے اسے اپنی جیسی مرکب اور محدود مخلوق سمجھ لیا اور اُسے خدا کا نام دے دیا ہے۔ اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وَمَنْ جَهِلَهٗ فَقَدْ اَشَارَ اِلَيْهِ. وَمَنْ اَشَارَ اِلَيْهِ فَقَدْ حَدَّهٗ. وَمَنْ حَدَّهٗ فَقَدْ عَدَّهٗ"

''جس نے خدا کو پہچانا نہیں اُس نے اُس کی جانب اشارہ کر دیا۔ اور جس نے اُس کی جانب اشارہ کیا اُس نے اُسے محدود کر دیا اور جس نے اُس کو محدود کر دیا اُس نے اُسے گنا اور وہ شرک کی وادی میں سرگرداں و پریشاں ہو گیا۔''

خدا کی طرف اشارہ کرنے سے کیا مراد ہے؟ اس میں دو احتمال دیے جا سکتے ہیں: پہلا احتمال: یہ ہے کہ یہ عقلی اشارہ ہے، دوسرا احتمال: یہ ہے کہ یہ عقلی اِشارہ بھی ہے اور حسّی اشارہ بھی ہے۔

وضاحت یہ ہے کہ جب انسان خدا کو اُس کی لامحدود اور بے کراں حقیقت کے مطابق نہیں پہچان سکتا تو وہ اُس کے حوالے سے ایک محدود سا مفہوم اپنے ذہن میں بٹھا لیتا ہے اور دوسرے الفاظ میں یہ کہ اُس کی جانب عقلی اشارہ کرتا ہے، اس طرح گویا اُس نے اُسے محدود جانا ہے، کیونکہ ایک لامحدود ہستی اُس انسان کے ذہن و تصور میں جو خود محدود ہے، سما ہی نہیں سکتی۔ یعنی انسان اُس شے کو درک کر سکتا ہے، جس پر اُس کا احاطہ ہو اور وہ شے اس کی محدود فکر میں سما سکے۔ اور ایسی چیز یقیناً اس کی طرح محدود ہی ہوگی۔ اور یوں خداوند عالم گنی جانے والی اشیا میں شمار ہوگا۔ کیونکہ محدود ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ ایک شے کسی اور جگہ پر بالکل اُس کی طرح تصور کی جا سکتی ہے۔ البتہ صرف اُس کا ثانی نہیں ہو سکتا جو ہر جہت اور ہر لحاظ سے لامحدود ہو اور وہ کسی بھی طرح کی گنتی میں نہ آ سکتا ہو۔ اِس لحاظ سے حضرت امام علیؑ نے اس مقام پر توحید کی حقیقت کو نہایت مختصر سی اور پُر معنی عبارت میں واضح کیا ہے کہ خداوند عالم ہر طرح کے خیال و گمان اور قیاس و وہم سے بالاتر ہے۔

یہ وہی بات ہے جو امام محمد باقر علیہ السلام کے کلام میں ایک خوبصورت تعبیر کے ساتھ آئی ہے، فرمایا:

''كُلُّ مَا مَيَّزْتُمُوهُ بِأَوْهَامِكُمْ فِي أَدَقِّ مَعَانِيهِ مَخْلُوقٌ مَصْنُوعٌ مِثْلُكُمْ مَرْدُودٌ إِلَيْكُمْ''

''جس چیز کو بھی اپنے وہم و گمان میں تصور کر لیجیے گرچہ کتنی ہی دقیق اور ظریف ہی کیوں نہ ہو، بہر حال وہ آپ کی بنائی ہوئی ایک مخلوق ہے اور وہ آپ کی جانب ہی لوٹ جائے گی جو آپ کی بنائی ہوئی، آپ کی تصور کی ہوئی اور آپ کی فکر میں سمائی ہوئی شے ہوگی، جبکہ خدا اس سے کہیں بلند و برتر ہے کہ کسی مخلوق کی محدود فکر و خیال میں سما سکے۔[1]

یہ احتمال بھی ہے کہ اشارے سے مراد، اشارۂ عقلی بھی ہو اور اشارۂ حسی بھی، کیونکہ خدا کی جسمانیت کا عقیدہ رکھنا بھی جہل کا نتیجہ ہے اور اس کا نتیجہ سوائے خدا کو محدود کرنے اور گنتی کے قابل سمجھنے اور مثال و نظیر کا قائل ہونے کے کچھ نہیں۔

سوال: اس مقام پر ایک سوال سامنے آتا ہے کہ اگر خداوند عالم کسی طور بھی عقلی اشارے کے قابل نہیں، تو پھر گویا معرفت خدا ہو ہی نہیں سکتی اور اُسے پہچاننے کے تمام دروازے انسان پر بند ہو گئے ہیں اور خدا شناسی کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہے گا، کیونکہ جب بھی ہم اُس پاک ذات کی معرفت کے لیے دست دراز کرنا چاہتے ہیں تو ہماری تمام تر رسائی اپنے افکار کی

---

[1] بحار الانوار، جلد ۶۶، صفحہ ۲۹۳

تخلیق کردہ کسی مخلوق تک محدود ہوجاتی ہے، اس طرح ہم جتنا اس کے قریب آنا چاہتے ہیں اتنا ہی دور پھٹکتے ہیں۔لہٰذا یہ کتنا بہتر ہوگا کہ ہم اس بھنور میں کود کر شرک میں پھنسنے کی بجائے خدا کی معرفت سے ہی کنارہ کشی اختیار کریں۔

جواب: ایک باریک نکتے پر توجّہ کرنے سے (جو یہاں بھی مشکل کشا ہے اور آگے بھی کام آئے گا) یہ سوال مزید واضح ہوجائے گا اور وہ یہ ہے کہ معرفت دو قسم کی ہوتی ہے: معرفت اِجمالی اور معرفت تفصیلی یا دوسرے الفاظ میں ذات کی پہچان اور افعال کے مبدأ کی پہچان۔اس سے زیادہ واضح تعبیر میں یوں کہیں کہ جب ہم اس عالم ہستی کو اور اس کی حُسن سے بھرپور رعنائیوں اور موجودات کی مختلف قسموں کو دیکھتے ہیں یا اپنے آپ کو دیکھتے ہیں تو سرسری طور پر یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ ان سب کا کوئی نہ کوئی خالق اور پروردگار ہے۔ یہ وہی اجمالی علم ہے، جو خدا کی معرفت کی نسبت انسان کی کوشش کا آخری مرحلہ ہے۔البتہ جس قدر انسان عالم ہستی کے اسرار سے آگاہ ہوتا چلا جائے گا، اتنا ہی اُس کی ذات کی عظمت سے آشنا ہوتا جائے گا اور اجمالی معرفت زیادہ سے زیادہ پرتاثیر ہوجائے گی۔لیکن جب اپنے آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا ہے؟ اور کیسا ہے؟ اور پھر جب اُس کی ذاتِ پاک کی حقیقت کی جانب دستِ نیاز کو پھیلاتے ہیں تو سوائے حیرت اور سرگردانی کے ہمارے دامن میں کچھ نہیں آتا، اُس وقت ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ اُس کی جستجو کی جانب راستہ مکمل طور پر کھلا بھی ہے اور مکمل طور پر بند بھی ہے۔اس مسئلے کو ایک مثال سے اس طرح واضح کیا جاسکتا ہے کہ قوت جاذبہ کے نام سے ایک قوت ہے، کیونکہ جو چیز بھی ہاتھ سے چھوڑ دی جائے وہ گر جاتی ہے اور زمین کی طرف کھنچی جاتی ہے اور اگر یہ قوتِ جاذبہ نہ ہوتی تو زمینی موجودات میں کوئی قرار وسکون نہ پایا جاتا۔

قوتِ جاذبہ سے آگاہی کوئی ایسی شے نہیں ہے، جو صرف سائنس دانوں کے لیے مخصوص ہو، بلکہ ننھے بچے بھی اسے اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں، مگر جاذِبہ کی حقیقت کیا ہے؟ آیا یہ کوئی نادیدہ لہریں ہیں یا نامعلوم ذرّات یا پھر کوئی اور طاقت ہے؟ عجیب بات تو یہ ہے کہ قوّتِ جاذِبہ اس دنیا کی تمام تر مادّی قوتوں میں سے ایک انوکھی خاصیت رکھتی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ مُنتقل ہونے کے لیے زمانے کی محتاج نہیں ہے۔

روشنی کے برعکس جو دنیائے مادّہ میں سب سے تیز رفتار حرکت کی قوّت ہے رکھتی ہے، مگر اس کے باوجود ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کے لیے اسے کئی ملین سال درکار ہوتے ہیں، لیکن قوتِ جاذبہ گویا ہر لمحے، دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں منتقل ہوتی رہتی ہے یا یُوں کہا جائے کہ اس کی کم سے کم سرعتِ رفتار بھی دنیا کی سمجھ سے بالاتر ہے۔آخر یہ کون سی قوت ہے، جس کے ایسے کرشمے ہیں؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ آج تک کسی کے پاس اس سوال کا مکمل جواب نہیں ہے۔اب یہ قوتِ جاذبہ جو مخلوقات میں سے ایک ہے، ہم اس کے متعلق کوئی تفصیلی علم نہیں رکھتے اور جو کچھ ہمیں پتا ہے وہ صرف

اجمالی علم ہے، تو پھر اس پورے مادّی جہاں کے خالق کو سمجھنا جو خود مادّے کے دائرے سے خارج اور بے نہایت اور لامحدود ذات ہے، تو پھر کیسے یہ توقع ہوسکتی ہے کہ ہم اس کی ذات کی تفصیلات سے باخبر ہو سکتے ہوں؟ پھر بھی اس کے باوجود اُسے ہر جگہ حاضر و ناظر اور ہر مخلوق و موجود کے ساتھ پاتے ہیں۔

با صد ھزار جلوہ برون آمدی کہ مَن	با صدھزار دیدہ تماشا کُنم تورا
تُو لاکھوں جلووں میں آیا نظر کہ میں	دیکھوں فقط تجھے کہ نگاہیں ہوں بے شمار

"وَمَنْ حَدَّهُ فَقَدْ عَدَّهُ"

یہ جملہ ایک دقیق نکتے کی جانب اِشارہ ہے، جو مندرجہ بالا بات سے مزید واضح ہوجاتا ہے اور وہ یہ کہ جب بھی انسان، خدا کو محدود ٹھہرائے، تو اُسے اللہ کے لیے عدد کا قائل ہونا پڑے گا یا دوسرے الفاظ میں اُس کے لیے کسی شریک کو ماننا پڑے گا، کیونکہ جو ہر جہت سے لامحدود ہو اُس کے لیے کوئی شبیہ، مانند، یا شریک کا ہونا ناممکن ہے، لیکن اگر وہ محدود ہے تو (چاہے اُس کی کتنی ہی رفعت اور عظمت و بلندی ہو) اُس کی کوئی نہ کوئی شبیہ اور مانند تصور ہوسکتا ہے کہ جو اُس کی ذات کے علاوہ ہوگا، یا پھر دوسرے الفاظ میں اُس جیسی دو یا چند محدود موجودات (چاہے جتنی بھی بڑی ہوں) تصور کی جاسکتی ہیں، مگر ہر لحاظ سے لامحدود ذات کے لیے اس جیسا دوسرا وجود تلاش کرنا ناممکن ہے اور اس راہ میں جتنی کوشش کرلیں، آخر میں اُسی کی طرف بازگشت ہوگی۔

تیسرا حصّہ

"وَمَنْ قَالَ فِيمَ ؟ فَقَدْ ضَمَّنَهُ، وَمَنْ قَالَ عَلَامَ ؟ فَقَدْ أَخْلىٰ مِنْهُ كَائِنٌ لَا عَنْ حَدَثٍ مَوْجُوْدٌ لَا عَنْ عَدَمٍ، مَعَ كُلِّ شَيْءٍ لَا بِمُقَارَنَةٍ، وَ غَيْرُ كُلِّ شَيْءٍ لَا بِمُزَايَلَةٍ فَاعِلٌ لَا بِمَعْنَى الْحَرَكَاتِ وَ الْآلَةِ بَصِيْرٌ إِذْ لَا مَنْظُوْرَ إِلَيْهِ مِنْ خَلْقِهِ، مُتَوَحِّدٌ إِذْ لَا سَكَنَ يَسْتَانِسُ بِهِ وَلَا يَسْتَوْحِشُ لِفَقْدِهِ"

"جس نے یہ سوال اٹھایا کہ وہ کس چیز میں ہے، اس نے اسے کسی کے ضمن میں قرار دے دیا اور جس نے یہ کہا کہ وہ کہاں مستقر ہے تو گویا اس نے ایک جگہ کو اس سے خالی جانا، اس کی ہستی حادث نہیں ہے اور اس کا وجود عدم کی تاریکیوں سے نہیں نکلا ہے۔ وہ ہر شے کے ساتھ ہے، لیکن مل کر نہیں، اور ہر شے سے الگ ہے، لیکن جدائی کی بنیاد پر نہیں۔ وہ فاعل ہے، لیکن حرکات

وآلات کے ذریعے نہیں اور وہ اس وقت بھی بصیر تھا، جب قابل رؤیت مخلوق کا وجود ہی نہیں تھا، وہ اپنی ذات میں یگانہ وتنہا ہے اور اُس کا کوئی ایسا ساتھی نہیں ہے، جسے پا کر اسے انس ومحبت اور کھونے کی صورت میں اضطراب و پریشانی کا احساس ہو۔''

شرح وتفسیر

اُس جیسی کوئی چیز نہیں

حضرت امام علیؑ خطبے کے اس حصّے میں چند نہایت حسّاس، دقیق اور ظریف توحیدی بحثوں کی جانب اشارہ کر رہے ہیں اور انہیں درج ذیل پانچ نکات کے قالب میں نہایت مختصر عبارات میں بیان فرما رہے ہیں:

اوّل: اُس کی ذات کے لامحدود ہونے یا دوسری عبارت میں مکان کی قید سے بالاتر ہونے کو یوں بیان فرمایا:

''وَمَنْ قَالَ فِيمَ ؟ فَقَدْ ضَمَّنَهُ''

''جو لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ خدا کس چیز میں ہے۔ انہوں نے اُسے موجودات کے اِحاطے میں تصور کر لیا۔''

لفظ ''فی'' اردو ادب میں اس کا متبادل لفظ ''میں'' کی قید اس وقت لائی جاتی ہے جب ایک موجود چیز بطور ظرف کسی دوسری چیز کو اپنے اندر سمالے اور اُس پر احاطہ کر لے، جیسے انسان کا گھر میں ہونا، پھول کا باغ میں ہونا یا گلاب کا پتّوں کے درمیان ہونا، جس کا نتیجہ اُس کی ذات کا محدود ہونا ہے۔ جیسا کہ ذکر ہو چکا توحید کے تمام دلائل یہ کہتے ہیں کہ اُس کی ذات ہر جہت اور ہر لحاظ سے لامحدود ہے۔

اسی طرح اگر کوئی سوال کرے:

''عَلَامَ فَقَدْ أَخْلىٰ مِنْهُ''

''خدا کہاں پر ہے؟ (عرش پر، کرسی پر، آسمانوں کی بلندیوں وغیرہ پر) اُس نے بھی خدا کو محدود شمار کیا۔''

کیونکہ اُس نے دوسرے مقامات کو اُس کے وجود سے خالی سمجھا ہے۔ اس بات کا لازمہ بھی یہی بنتا ہے کہ اُس کی ذات محدود ہو جو واجب الوجود سے سازگار نہیں، اس بنا پر تمام وہ لوگ جو اُسے عرش یا آسمانوں کی بلندیوں پر سمجھتے ہیں وہ خالص مُوَحِّد نہیں ہیں اور درحقیقت وہ کسی ایسی مخلوق کی پرستش کرتے ہیں جسے انہوں نے اپنے فکر وخیال میں تخلیق کر لیا ہے اور اُس کا نام اللہ رکھ دیا ہے (چاہے وہ لوگ عوام ہوں یا خواص کے مخصوص لباس میں) بعض اوقات کچھ ناواقف لوگ یہ سمجھتے

ہیں کہ آیتِ مبارکہ: "اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى"[1] خدا کا جسمانیت کے لبادے میں عرش پر واقع ہونے کی دلیل ہے جب کہ لفظ ''اِسْتَوٰیٰ'' صرف کسی شے پر سوار ہونے یا بیٹھنے کے معنی میں نہیں آتا، بلکہ کسی شے کی باگ ڈور ہاتھ میں رکھنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اور اُصولاً "اِسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ" کی یہ تعبیر، تخت سلطنت پر قرار پانے اور اِقتدار سنبھالنے کے معنی میں آتی ہے۔

اس کے مقابل ''تَلَّ عَرْشُهُ'' کی تعبیر ہے، جس کے معنی ہیں اُس کا تختہ ٹوٹ گیا، یہ ایک معروف و مشہور تعبیر ہے، جو برسر اقتدار آنے یا حکومت سے کنارہ کشی اختیار کرنے سے کنایہ ہے۔ تخت کے ٹوٹ جانے یا تخت سلطنت پر بیٹھنے کے معنی میں نہیں ہے، لہٰذا "اِسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ" کا مطلب خدا کی حکومت اور حاکمیت کا عرش پر استقرار ہونا ہے۔

بہر حال یہ نہایت سطحی بات ہوگی کہ مذکورہ تعبیر سے خدا کی جسمانیت کا توہم کیا جائے۔

دوّم: دوسرے حصّے میں خدا کے ازلی ہونے اور ہمیشہ سے ہونے اور اُس کے، وقت اور زمانے کی قید سے آزاد ہونے کے بارے میں فرماتے ہیں:

"كَائِنٌ لَا عَنْ حَدَثٍ"

''وہ ہمیشہ سے تھا اور کسی چیز سے نہیں بنا۔''

"مَوْجُودٌ لَا عَنْ عَدَمٍ"

''وہ ایسا موجود ہے، جو عدم سے نہیں نکلا۔''

لہٰذا وہ تمام مخلوقات سے مختلف ہے، کیونکہ وہ سب ''حُدوث و عدم'' کا سابقہ رکھتی ہیں۔ گویا یوں کہا جائے کہ وہ سب ماضی میں کبھی نہیں تھیں اور بعد میں بنی ہیں۔ مگر واحد ایسا وجود جس کا کوئی سابقۂ عدم نہیں ہے وہ اللہ ہی کی ذاتِ پاک ہے

---

[1] سورۂ طٰہٰ، آیت ۵

۔''کائن''اور''موجود'' کا مفہوم مخلوق کی صفات اور سابقۂ عدم کو واضح کیے بغیر سمجھنا ممکن نہیں۔ [۱]

سوم: اگلے جملے میں نہایت لطیف انداز سے مخلوقات کا خالق سے گویا ممکن الوجود کا واجب الوجود سے تعلق بیان فرمایا ہے:

''مَعَ كُلِّ شَيْءٍ لَا بِمُقَارَنَةٍ، وَ غَيْرُ كُلِّ شَيْءٍ لَا بِمُزَايَلَةٍ''

''وہ ہر چیز کے ساتھ ہے، مگر ایسا نہیں کہ اُس کا ہم نشین اور مثل بن جائے اور ہر چیز کا غیر ہے، مگر اس طرح نہیں کہ اُس سے بے گانہ اور جُدا ہو جائے۔''

بہت سے لوگ حتیٰ کہ بہت سے دانشور حضرات اور فلسفی بھی خدا اور موجودات کے رابطے کو، دو مستقل وجودوں کا ایک دوسرے سے رابطہ سمجھتے ہیں، جن میں سے ایک مخلوق اور دوسرا خالق ہے جیسا کہ ایک بڑا سا شعلہ ہو اور اُس سے ایک چھوٹی سی شمع جلائی جائے، جبکہ حقیقت یہ نہیں ہے، مخلوق اور خالق کا آپس میں فرق کسی کمزور اور طاقتور وجود کا فرق رکھنا نہیں ہے، بلکہ ہر جہت اور ہر لحاظ سے ایک مستقل وجود کا، ایک وابستہ اور محتاج وجود کا فرق ہے۔ تمام عالم ہستی اُس سے وابستہ ہے اور لمحہ بہ لمحہ اُس سے نورِ وجود حاصل کرتا ہے۔ خداوند عالم اس عالمِ ہستی سے جدا بھی نہیں ہے مگر اس کے باوجود موجوداتِ عالم بھی نہیں ہے۔ (جیسا کہ وحدتِ وجود اور موجود کے قائل حضرات نے صُوفیہ سے یہ نظریہ لیا ہے) جبکہ حقیقی توحید اس حقیقت کو درک کرنے سے مشروط ہے، ایک مثال سے بات واضح ہوگی، اگرچہ یہ مثال بھی ناقص ہے کہ سورج کی روشنی اور دُھوپ کا وجود، اگرچہ روشنی، سورج سے الگ شے ہے، مگر اُسی سے وابستہ اور جڑی ہوئی ہے، یعنی غیر تو ہے مگر اس کا غیر ہونا بیگانہ اور جدا ہونے یا اپنا الگ اور مستقل وجود رکھنے کے معنی میں نہیں ہے، گویا اُس کے ساتھ بھی ہے اور اسے ایک جسم بھی نہیں کہا جا سکتا، بے شک اِس عالم کے موجودات کا اُس ذاتِ پاک سے وابستہ اور جڑا ہوا ہونا اس سے بھی زیادہ نزدیک اور مضبوط ہے اور درحقیقت اس سے زیادہ بہتر مثال پیش کرنا نہایت مشکل ہے، جو اس جہاں میں وابستگی اور استقلال (وحدت در کثرت) کو

---

[۱] بعض شارحینِ نہج البلاغہ نے مندرجہ بالا دو جملوں کو ایک مطلب اور مفہوم پر دو عبارات شمار کیا ہے، ابنِ ابی الحدید نے جملۂ اوّل ''کائن لاعن حدث'' کو عدم حدوث زمانی جبکہ جملہ دوم ''موجود لاعن عدم'' کو عدم حدوثِ ذاتی شمار کیا ہے۔ یعنی پہلے جملے میں حضرتؑ فرما رہے ہیں: خداوند متعال کے لیے کوئی ایسا زمانہ تھا ہی نہیں جب وہ حادث ہوا ہو، اور دوسرے جملے میں زمانے سے قطع نظر یہ فرما رہے ہیں کہ اُس کی ذات میں حدوث نہیں ہے، بلکہ وہ واجب الوجود ہے (شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید جلد ۱، صفحہ ۷۹) جبکہ دوسرے شارحین نے اس کے برعکس بیان کیا ہے، یعنی پہلا جملہ حدوثِ ذات کی نفی ہے اور دوسرا جملہ حدوثِ زمانی کی نفی ہے (شرحِ نہج البلاغہ ابنِ میثم جلد ۱، صفحہ ۱۲۷) البتہ ان دونوں پر کوئی تسلی بخش دلیل نہیں ہے، کیوں کہ ''حدوث'' کا لفظ معمولاً حدوث زمانی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جب کہ حدوثِ ذاتی پر بھی اطلاق ہوتا ہے، جیسا کہ ''عدم'' کا لفظ معمولاً عدمِ زمانی کے لیے استعمال ہوتا ہے، جب کہ عدم ذاتی پر بھی اطلاق ہوتا ہے، لہٰذا ان دونوں جملوں کو ایک دوسرے کے لیے تاکید کہا جائے تو بہتر ہے، یعنی دونوں جملے حدوثِ زمانی و ذاتی کی نفی کر رہے ہیں گویا حدوث و عدم ذات اور زمان دونوں لحاظ سے اللہ کے لیے قابلِ تصور نہیں ہیں۔

بیان کرتی ہو، اگر چہ اوپر بیان کی گئی مثالیں یا انسان کے ذہن کے تصورات جو اُس کی روح سے وابستہ ہیں، مگر اُس روح سے جدا بھی ہیں، کسی حد تک موضوع کو واضح کر دیتے ہیں۔ (غور کیجیے)

چہارم: اگلے جملے میں اُس ذاتِ پاک کی ایک اور صفت کی جانب اشارہ فرماتے ہیں:

"فَاعِلٌ لَا بِمَعْنَى الْحَرَكَاتِ وَالْآلَةِ"

''وہ کاموں کو انجام دینے والا ہے، مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ حرکات یا آلات کے ذریعے کام انجام دیتا ہے۔''

ہم روزمرہ کی گفتگو میں عام طور پر، کام کا کرنے والا اور فاعل کا لفظ اُس پر صادق آتا ہے جو اپنے ہاتھ پاؤں، سر، گردن اور دیگر اعضائے بدن کے استعمال سے کوئی کام انجام دے، اور جہاں تک انسان اور تمام جانداروں کی قدرت کی بات ہے تو وہ انجامِ افعال میں محدود ہے، یعنی انسان کو اوزار اور آلات کی ضرورت پڑتی ہے، وہ ہتھوڑے سے کیل ٹھونکتا ہے، آری سے لکڑی کاٹتا ہے، اور نفیس اور ظریف آلاتِ کار سے چھوٹے چھوٹے ذرّات کو اِدھر سے اُدھر کر سکتا ہے اور بلڈوزر اور کرین کے ذریعے بھاری سامان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر لیتا ہے، یہ سب جسم اور جسمانیت کے آثار ہیں، جہاں تک خدا کا معاملہ ہے تو اُس کا نہ کوئی جسم ہے نہ حد ہے، جس کے دائرے میں وہ محدود ہو۔ اُس کا فاعل ہونا ہرگز کسی حرکت کے انجام دینے کے مطلب میں نہیں اور وہ اپنی لامحدود قدرت کی وجہ سے آلات و وسائل کا محتاج نہیں ہے۔ اُصولی بات تو یہ ہے کہ خدا اس وقت سے فاعل ہے جب کسی آلے کا وجود ہی نہیں تھا۔ اگر اُسے آلات کی ضرورت ہوتی تو وہ پہلے خلق کی ہوئی اشیاء کو بھی خلق نہ کر پاتا۔

جی ہاں! وہ ایک چشم زدن میں یا ایک لمحے یا پھر اُس سے بھی کم تر وقت میں صرف ایک ارادے اور ایک ''کُن'' کے حکم سے تمام عالمِ ہستی کو ایجاد یا ختم کر سکتا ہے یا بتدریج جس چیز کو جتنی مدّت میں خلق فرمانا چاہے اُسے اتنی مدت میں وجود میں لا سکتا ہے۔ تو اس پر توجّہ رکھنی چاہیے کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ فاعِل ہے تو اُس کی فاعلیت (کر سکنے کی صلاحیت) کو اپنی ذات پر قیاس نہ کریں اور اُسے آلات و حرکات کا محتاج نہ جانیں۔ البتہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا فرشتے (مُدَبّراتُ اَمْر) یعنی کام انجام دینے والے نہیں رکھتا۔ وہ بہت سے کاموں کو اَسباب کے ذریعے سے کرتا ہے اور انھیں وجود بخشتا ہے۔ یعنی خدا کا ارادہ ان چیزوں سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ وہ ان چیزوں کا محتاج ہے۔

پنجم: اگلے جملے میں اِضافہ فرماتے ہیں:

"بَصِيرٌ إِذْ لَا مَنْظُورَ إِلَيْهِ مِنْ خَلْقِهِ"

''وہ دیکھنے والا ہے، اُس وقت سے جب کوئی دکھائی دینے والی شے بھی وجود نہیں رکھتی تھی۔''

یہ بات درست ہے کہ لفظ بصیر یعنی دیکھنے والا، اسے لفظ بصر کے مادّے سے لیا گیا ہے، جس کا مطلب ہے آنکھ، مگر یہ خداوندِ عالم کے بارے میں ہرگز اپنے حقیقی معنوں میں استعمال نہیں ہوتا، بلکہ دوسرے الفاظ میں ایسا مجاز ہے جو حقیقت سے بالاتر ہے۔ خدا کا بصیر ہونا یعنی تمام دیکھنے میں آنے والی اشیا سے آگاہ ہونا حتیٰ کہ دیکھنے میں آنے والی اشیا کی خلقت سے پہلے بھی بصیر تھا۔ لہٰذا اُس کا بصیر ہونا، اُس کے بے انتہا علم کی طرف اشارہ ہے اور ہم جانتے ہیں کہ علمِ خدا ''ازلی'' ہے۔ موضوع کے آخری جملے میں حضرت علی علیہ السلام اُس ذات کا، کسی بھی طرح کے مونس وغمخوار کے وجود سے بے نیاز ہونا بیان فرماتے ہیں:

''مُتَوَحِّدٌ اِذْلَا سَكَنَ يَسْتَأْنِسُ بِهٖ وَلَا يَسْتَوْحِشُ لِفَقْدِهٖ''[1]

''وہ تنہا ہے کیونکہ، کوئی ایسا نہیں جو اُس کا مونس ہو اور وہ اُس کے نہ ہونے پر وحشت زدہ ہو جائے۔''

اس کی وضاحت یوں ہے کہ انسان اور دوسری زندہ مخلوقات کی قدرت کم اور محدود ہے، لہٰذا وہ اپنے تمام فائدے حاصل نہیں کر سکتے اور نہ ہی تمام نقصانات کو دور کر سکتے ہیں۔ تو ایسے میں وہ اپنے جیسے یا بعض اوقات اپنی نوع کے علاوہ کسی اور مخلوق سے مدد لینے کے محتاج ہوتے ہیں تا کہ اپنے ساتھ پیش آنے والے خطروں کو ٹال کر، سکون اور اَمن کا احساس حاصل کر سکیں۔ اسی وجہ سے انسان کے لیے تنہائی وحشت ناک اور دوسرے افراد کا اس کے پاس ہونا آرام بخش ہے، خاص طور پر خطروں، آفات وَبلیّات اور بیماریوں کے وقت۔ بعض اوقات یہ محدود فکر انسان، خدا کو اپنے آپ سے قیاس کرتا ہے اور تعجب کرتا ہے کہ وہ مخلوقات سے پہلے تنہا تھا!!! کیونکہ اُس کا کوئی انیس ومونس نہیں ہے اور اس تنہائی کے باوجود وہ پُرسکون کیسے ہے؟ یہ انسان اس بات سے بے خبر ہے کہ وہ ایک لامتناہی وجود ہے، نہ کسی چیز کا محتاج ہے کہ مدد لے اور نہ کسی دشمن سے اسے کوئی خوف ہے جس کی وجہ سے اسے کسی اور سے مدد مانگنی پڑے، نہ اُس کی کوئی شبیہ ہے نہ کوئی اُس جیسا جس کو وہ اپنا مونس بنائے۔ اسی دلیل پر وہ متوّحد (یعنی ہمدم ومونس کے بغیر) ہے اور رہے گا، یہاں (مُتَوَحِّدٌ) کا لفظ، واحد اور ''اَحَدٌ'' کے مفہوم کے علاوہ استعمال ہوا ہے۔

---

[1] یہاں یہ بات کہ کیا ''اذ'' اس جگہ پر ظرفیت کے معنیٰ میں آیا ہے تو گویا ازل میں کوئی اس کے علاوہ تھا ہی نہیں جو اس کا مونس وغم خوار قرار پائے۔ یا وہ اس کے فقدان سے غم زدہ ہو جائے یا پھر ''اذ'' یہاں تعلیل (بیانِ علّت) کے معنیٰ میں ہے۔ گویا کوئی تھا ہی نہیں وہ ہمیشہ سے یکتا ہے لہٰذا آج بھی یکتا ہے اور کسی شخص یا شے کی اسے ضرورت وحاجت نہیں ہے البتہ دوسرا احتمال زیادہ قوی دکھائی دیتا ہے، یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ لَا يَسْتَوْحِشُ میں لفظ لا، زائدہ ہے اور تاکید کے لیے آیا ہے، اگرچہ بعض افراد نے اسے جملہ کو مستانفہ شمار کیا ہے۔

نکات

یہاں بہت سے پُر معنی نکات چھپے ہوئے ہیں، جن سے گراں قدر درس ملتے ہیں، نتیجتاً بہت سے اعتقادی مسائل خاص طور پر ''معرفت خدا اور اُس کے اَسماء اور صفات'' سے متعلق مسائل حل ہو جاتے ہیں، من جملہ:

۱۔ مخلوق اور خالق کا رابطہ اور وحدتِ وجود کا مسئلہ

خالق کا مخلوق سے اور پیدا کرنے والے کا، پیدا ہونے والوں سے کیا رابطہ ہے، اِس مسئلے پر فلسفیوں اور دانشوروں میں کافی بحث و مباحثے پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ نے اِفراط کا راستہ پکڑ لیا ہے اور موجود اور وُجود کے درمیان وحدت کو بیان کرتے ہیں اور اُسے عین مخلوقات قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عالم ہستی میں ایک وجود کے علاوہ کوئی وجود نہیں اور اُس کے علاوہ جو بھی ہے وہ اُس کی ذات کے جلوے ہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں درحقیقت ایک چیز کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے اور تعداد اور کثرت محض خیال اور سراب ہے جو دُور سے پانی نظر آتا ہے، مگر درحقیقت کچھ نہیں ہے۔

بعض اوقات وحدت واتحاد کے بجائے حلول کی تعبیر بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ ہر وقت کسی ایک لباس میں اُترتا ہے، اور کہتے ہیں کہ یہ بے خبر لوگ دوگانگی کا احساس غلط کرتے ہیں، جبکہ ایک وجود سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔[1] مختصراً یہ کہ لوگ عالم ہستی کو دریا کی طرح سمجھتے ہیں اور موجوداتِ عالم کو دریا کے قطروں کی طرح:

ہر کس کہ ندیدہ قطرہ با بحر یکی — حیران شدہ اَم کہ چون مسلمان باشد؟

قطرے میں نہ جو بحر کا نظّارہ کرے — حیران ہوں میں کیسا مسلمان ہے وہ ؟

گویا یہ لوگ ثنویّت کو نہیں مانتے اور اسے خیالِ محض کہتے ہیں اور ان کے مطابق اگر کوئی وجود اور موجود کی وحدت کو نہ تسلیم کرے، تو وہ صحیح معنی میں صوفی نہیں کہلا سکتا، کیوں کہ تصوّف کی بنیاد ہی وحدت الوجود ہے!! البتہ ان کے بعض کلمات

---

[1] بہت سے متصوفہ یہی بات کرتے ہیں، جیسا کہ ان کے بزرگوں سے نقل ہے کہ بعض کہتے ہیں "انی انا اللہ" میں خدا ہوں، بعض نے نغمے بنائے کہ سبحانی ما اعظم شانی" میں منزّہ ہوں، میرا مقام کتنا بلند ہے حتیٰ کہ بعض نے تو اپنے اشعار میں کہہ دیا کہ بت پرستی بھی خدا پرستی ہے:

مسلمان گر بدانستی کہ بت چیست — یقین کردی کہ حق در بت پرستی است!

جیسا کہ مولوی کے قابلِ اعتراض اشعار میں (نعوذباللہ) اللہ کو ایک مکار اور عیّار بت شمار کیا ہے۔ جو کبھی آدمؑ کی شکل میں کبھی نوحؑ کی شکل میں اور کبھی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شکل میں آیا اور ایک دن علیؑ اور ذوالفقار بن کر آیا اور بالآخر ایک دن منصور کے قالب میں ڈھل گیا اور سولی پر چڑھ گیا۔ (عارف وصوفی چہ می گویند، ص ۱۱۷)

قابلِ توجیہہ ہیں، مثلاً یہ لوگ کہتے ہیں کہ وجودِ حقیقی جو عالم میں قائم بالذّات ہے، وہ ایک سے زیادہ نہیں اور باقی تمام موجودات اس سے وابستہ ہیں (جیسا کہ معنی اسمیہ اور حرفیہ کے بارے میں بات ہوئی) گویا ذاتِ خداوند عالم کے علاوہ جو ہے وہ اتنا چھوٹا اور حقیر ہے کہ اسے حساب میں لانا صحیح نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کا وجود ہی نہیں ہے۔

مگر بلاخوفِ تردید اُن کی کچھ باتیں توجیہہ اور دفاع کے قابل نہیں۔ وہ کھلم کھلا کہتے ہیں کہ عالمِ ہستی میں ایک سے زیادہ وجود پائے نہیں جاتے اور باقی سب کے سب خیالات اور وہم وگمان ہیں، یہاں تک کہ بُت پرستی کو بھی اگر محدود شکل نہ دی جائے تو وہ بھی عین خدا پرستی ہے، کیونکہ سارا عالم وہی ہے اور وہ ہی سارا عالم ہے۔ یہ جملہ کسی کا بھی ہو، اس سے ہٹ کر کہ یہ باتیں بعید از عقل، بلکہ بعید از بدیہیّات ہیں۔ یہ لوگ علّت ومعلول، خالق ومخلوق، عابد ومعبود سب کا سرے سے انکار کر رہے ہیں۔

یہ اسلامی عقائد کے لحاظ سے بھی فاسد نظریات ہیں، جو کسی سے پوشیدہ نہیں، کیونکہ اِس طرح تو خدا، بندہ، پیغمبرؐ، امّت، عابد ومعبود اور شارع ومکلّف کا کوئی مفہوم ہی باقی نہیں رہے گا۔ یہاں تک کہ جنّت ودوزخ، بلکہ جنّتی اور دوزخی لوگ سب کے سب ایک جیسے ہو جائیں گے۔ اور سب کے سب اُس کے عینِ ذات ہیں اور یہ دونگانگی اور تمام موجودات کا جُدا جُدا ہونا سب وہم وخیال کی پیداوار ہیں کہ اگر ہم خیالات اور وہم کے پردوں کو چاک کر دیں تو اُس کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہوگی، وغیرہ وغیرہ۔

اس عقیدے کا سب سے خطرناک لازمہ یہ ہوگا کہ خدا مجسّم ہے یا وہ حلول کر سکتا ہے، یوں طرح سے یہ نظریہ نہ تو عقلِ سلیم کے لیے قابلِ قبول ہے اور نہ عقائدِ اسلامی اور قرآن مجید کے ساتھ سازگار ہے، اسی لیے فقیہِ نامدار مرحوم محقق یَزدی (قدس سرہ) عُروَۃُ الوُثقیٰ کے متن میں کفّار سے متعلق بحث میں لکھتے ہیں:

"لَا اِشْكَالَ فِيْ نَجَاسَةِ الْغُلَاةِ وَ الْخَوَارِجِ وَ النَّوَاصِبِ وَ أَمَّا الْمُجَسِّمَةُ وَ الْمُجَبِّرَةُ وَ الْقَائِلِيْنَ بِوَحْدَةِ الْوُجُوْدِ مِنَ الصُّوفِيَةِ اِذَا الْتَزَمُوْا بِأَحْكَامِ الْاِسْلَامِ فَالْاَقْوىٰ عَدَمُ نَجَاسَتِهِمْ اِلَّا مَعَ الْعِلْمِ بِالْتِزَامِهِمْ بِلَوَازِمِ مَذَاهِبِهِمْ مِنَ الْمَفَاسِدِ"[1]

غالیوں وخوارج ونواصب [2] کے ناپاک ہونے میں کوئی شک نہیں اور وہ لوگ جو خدا کے مجسّم ہونے اور جبر کے

---

[1] عُروَۃُ الوُثقیٰ، بحثِ نجاستِ کافر، مسئلہ ۲

[2] غلاۃ، یعنی وہ افراد جو ائمہ اہل بیتؑ خاص طور پر حضرت علیؑ کے بارے میں غلو کرتے ہیں اور انہیں (نعوذ باللہ) خدا (رب اور اللہ) یا خدا سے متحد قرار دیتے ہیں جبکہ "خوارج" وہ باقی ماندہ گروہ ہے جس نے جنگِ نہروان میں حضرت علیؑ سے جنگ کی اور شکست کھائی۔ اسی طرح "نواصب" دشمنانِ اہل بیتؑ کو کہا جاتا ہے۔

قائل ہیں اور اسی طرح صُوفیہ میں سے ایک ایسا گروہ جو وحدتِ وجود کا عقیدہ رکھتا ہے، اگر یہ لوگ احکامِ اسلام پر عمل کرتے ہوں تو اَقویٰ یہ ہے کہ وہ نجس نہیں ہیں، لیکن اگر یہ واضح طور پر معلوم ہوجائے کہ یہ عَقائدِ مُفسدہ کے پابند ہیں، جو ان کے مذہب کا لازمہ ہے تو وہ کافر ہیں۔ اس عبارت میں دو نکات قابلِ توجّہ ہیں: ایک تو یہ کہ عقیدۂ وحدتِ وجود کے قائل افراد کو جبریین اور جسمانیت کے قائل حضرات کی صَف میں شمار کیا گیا ہے۔

اور دوسرا یہ کہ اُن کے عقائد ایسے دینی مفاسد سے بھرپور ہیں کہ اگر وہ اُن پر عمل پیرا اور پابند ہوں، تو مسلمان نہیں ہیں اور اگر اِن لوازمات کے پابند نہ ہوں تو مسلمانوں کے زُمرے میں ہوں گے۔ یہاں یہ وضاحت ہوجاتی ہے کہ اُن کے مذہب میں ایسے مفاسد شامل ہیں کہ اگر اُن پر ملتزم ہوں، تو مسلمانوں کی صف سے ہی خارج ہوجاتے ہیں۔

قابلِ توجّہ بات یہ ہے کہ ہماری معلومات کے مطابق ''عُروَۃُ الوُثقیٰ'' پر حاشیہ لکھنے والے تمام افراد نے اس بات کو قبول کیا ہے یا پھر کسی ایک قید کا اضافہ کیا ہے۔ (مثلاً توحید اور رسالت کے انکار کا موجب نہ بنیں)[1] یہ مسئلہ کون کون سے مفاسد کا باعث بن سکتا ہے، اس کی وضاحت کے لیے، مثنوی کے کچھ اشعار کی طرف اشارہ مناسب رہے گا۔ مثنوی کی چوتھی کتاب میں ایک طولانی داستان کے ساتھ ''سُبحَانِیْ مَا اَعظَمَ شَانِیْ'' کا قصّہ ذکر کیا گیا ہے جو بایزید سے متعلق ہے، جب اُس کے مریدوں نے اُس پر اعتراض کیا کہ آپ نے یہ کیسا نامناسب جملہ کہا ہے۔ گویا تو اپنے اس جملے میں اپنے آپ کو ''لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُونِی'' میرے سوا کوئی معبود نہیں پس میری عبادت کرو کا مصداق ٹھہراتے ہو، تو اُس نے جواب دیا کہ اگر میں نے یہ جملہ دوبارہ کہا تو تم سب کلہاڑیاں اُٹھا کر مجھ پر حملہ کر دینا۔ اور شعر پڑھا:

نیست اندر جبہ ام غیر از خدا　　چند جوئی در زمین و در سما

کوئی بھی مجھ میں نہیں غیرِ خدا　　ڈھونڈ آؤ چاہے تم ارض و سما

اُس کے مریدوں نے کلہاڑیاں اُٹھا کر اُس پر حملہ کیا، مگر اُن لوگوں نے دیکھا کہ جو کلہاڑی وہ اُسے مار رہے ہیں، وہ خود ان کو زخمی کر رہی ہے۔ یہ بناوٹی افسانہ بتاتا ہے کہ اس راستے کے لوگ کس حد تک آگے بڑھ سکتے ہیں۔ اس گفتگو کو علمائے عصر حاضر میں سے ایک عالم کے جملے پر ختم کرتے ہیں جو شرح نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں: ''یہ مکتب فکر (وحدتِ وجود یعنی وحدتِ مُوجود) تمام تر عقلی و فکری اور بصیرتی قوانین کو اور اَدیان الٰہی کے مقاصِد کو پامال کر رہا ہے، یہ پورے عالم کو خدا کے مرتبے تک بلند کرتا ہے، یا پھر خدا کو مخلوقات کی حد و معیار تک نیچے لا کر مخلوقات کے ساتھ ایک بنا دیتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ اِس

---

[1] مزید معلومات کے لیے ''مصباح الہدیٰ'' جلد ۱، ص ۴۱۰، تالیف مرحوم آیۃ اللہ شیخ محمد تقی آملی (فقیہ و فلسفی) اور اسی طرح تقریرات مرحوم آیۃ اللہ خوئی جلد ۳، ص ۸۱، ۸۲ ملاحظہ کریں۔

مکتبِ فکر نے بعض لوگوں کے اذہان کو ان کے ذوق سلیقہ یا اِشکالات واعتراضات سے فرار اختیار کرنے کے عنوان سے جھکڑ لیا ہے، نہ یہ کہ نفسیاتی طور پر غور وفکر اور حقائق سے آگاہی کے لیے تدبیر کی راہوں کو مسدود کیا ہوا ہو۔ [۱]

۲۔ صفاتِ خدا کی حقیقت سے جاہلانہ اِنحراف

اگر ہم مولا علیؑ کے کلام کے اس فقرے کو بخوبی سمجھنے کی کوشش کریں تو اصلِ توحید اور حقیقت صفاتِ خدا سے انحراف کے تمام تر راستے بند ہو جائیں گے اور ان آیات کا حقیقی مفہوم واضح ہو جائے گا۔

"وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ" [۲]

''ہم انسان کی رگِ گردن (شہ رگ) سے زیادہ اُس کے قریب ہیں''۔

اور اسی طرح کا مفہوم دیگر آیات قرانی میں بھی پایا جاتا ہے:

"وَ هُوَ مَعَكُمْ اَیْنَمَا كُنْتُمْ"

''وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں بھی تم رہو'' [۳]

"وَ مَا یَكُوْنُ مِنْ نَجْوٰی ثَلَاثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ" [۴]

''کوئی بھی بات کسی تین افراد کے درمیان نہیں ہوتی، مگر یہ کہ وہ اُن کا چوتھا ہوتا ہے''

"اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ"

''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے'' [۵]

"وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَ قَلْبِهٖ" [۶]

''جان لو کہ اللہ انسان اور اُس کے قلب کے درمیان حائل ہو جاتا ہے''

یہ نکتہ وحدتِ وجود سے متعلق تمام تر بحثوں کو (صحیح معنوں میں) مکمل کر دینے کے عِلاوہ صفاتِ خدا کو سمجھنے کی راہ کے

---

[۱] ترجمہ وتفسیر نہج البلاغہ، اُستاد جعفری، جلد ۲، صفحہ ۶۴

[۲] سورۂ قٓ، آیت ۱۶

[۳] سورۂ حدید: آیت ۴

[۴] سورۂ مجادلہ: آیت ۷

[۵] سورۂ نور: آیت ۳۶

[۶] سورۂ اَنفال: آیت ۲۴

تمام ممکنہ اِنحرافات کا راستہ روک دیتا ہے۔ مگر افسوس وادیِ حیرت کے بھٹکے ہوئے لوگ اُن مسائل میں پڑ گئے ہیں کہ جن کے بیان سے انسان کو شرم آتی ہے۔ من جملہ وہ لوگ جو مجسمہ کہلاتے ہیں، یعنی خداوند متعال کے لیے صفاتِ ممکنات کے قائل ہیں اور اُسے جسم و جسمانیات کی حد تک نیچے لے آتے ہیں اور اُس کے لیے ہاتھ، پاؤں، شکل وصورت اور گھنگریالے بالوں اور اُس کے لیے زمان و مکان کے قائل ہیں۔ کچھ لوگ اُسے دنیا میں دیکھنے کے قابل تصوّر کرتے ہیں اور کچھ لوگ اُسے آخرت میں قابلِ دید سمجھتے ہیں۔

''محقق دَوانی'' جو معروف فلسفی ہیں، بحارُ الانوار سے نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں: اہلِ تشبیہ میں سے ایک گروہ، خدا کا حقیقتاً جسم سمجھتا ہے۔ بعض اُسے گوشت اور خون سے مُرکب سمجھتے ہیں، اور بعض اُسے ایسا چمکتا ہوا نُور سمجھتے ہیں جو چاندی کے سُفیدی مائل ڈلے جیسا ہے اور اُس کی لمبائی اِن لوگوں کے اپنے ہاتھ کی سات بالشت کے برابر ہے۔ ایک گروہ اُسے انسان جیسا اور ایک گروہ کے افراد اُسے ایک سادَہ لوح جوان کی طرح سمجھتا ہے کہ جس کے گھنگریالے بال ہیں اور بعض اُسے ایک کالے اور سفید بالوں والے بوڑھے شخص سے تشبیہ دیتے ہیں اور بعض اُسے (دوسرے جسموں سے مختلف) ایک جسم سمجھتے ہیں اور بعض افراد اسی طرح مختلف قسم کے باطِل، بے بنیاد اور سطحی عقیدے رکھتے ہیں۔ [۱]

اس سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ رسولِ خداؐ اور بعض صحابہ سے کچھ روایات نقل کی ہیں (جو کہ بے بنیاد اور جعلی احادیث ہیں) اُن میں خدا کے عجیب و غریب جسمانی اوصاف ذکر ہوئے ہیں۔ مثلاً ایک حدیث جو ابنِ عباسؓ سے نقل کی ہے کہ ان سے پُوچھا گیا: کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی اپنے پروردگار کو دیکھا ہے؟ تو ابنِ عباسؓ نے کہا: ہاں۔ سوال کیا گیا: خدا کو کیسا پایا؟ تو کہا: ایک ہرے بھرے سرسبز باغ میں دیکھا کہ وہ ایک سونے کی کُرسی پر بیٹھا ہوا ہے اور اُس کے نیچے ایک سنہرا فرش بچھا ہوا ہے جسے چار فرشتوں نے اُٹھایا ہوا ہے۔ [۲] البتہ اِس طرح کی بہت سی روایات صحیح بُخاری اور سنن ابنِ مَاجہ وغیرہ میں نقل ہوئی ہیں، جن میں وضاحت کے ساتھ یہ کہا گیا ہے کہ خدا بروزِ قیامت آنکھوں سے دیکھا جائے گا۔ [۳] یہاں تک کہ بعض روایات میں تو یوں وضاحت کی گئی ہے کہ اہلِ جنت خدا کو ایسے دیکھتے ہیں جیسے چودھویں کی رات میں چاند نظر آتا ہے۔ [۴] اِن اَحادیث کی وجہ سے بہت سے اہلسنّت دانشور خدا کے دیکھے جانے کے معتقد ہیں اور اس موضوع کا پُرزور

---

[۱] بحارُ الانوار، جلد ۳، ص ۲۸۹

[۲] توحید ابنِ خذیمہ ص ۲۱۷ مطابق بحوث فی الملل والنحل جلد ۱، ص ۱۴۵

[۳] صحیح بُخاری، جلد ۶، ص ۵۶، تفسیر سورۂ نساء اور سُنَنِ ابن مَاجہ، جلد ۱ مقدمہ باب ۱۳ حدیث ۱۷۷

[۴] ان کے جعلی ہونے کے اعتقاد کے ساتھ اور ان روایات کے جوابات جو کہ آیات اور روایات سے ہی ہیں کہ خدا ان آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا نہ دنیا میں اور نہ ہی آخرت میں، جلد ۴، تفسیر موضوعی پیامِ قرآن صفحہ ۲۴۱ تا ۲۵۱ کی طرف رجوع کریں۔

دفاع بھی کرتے ہیں۔ جب کہ قرآن وضاحت کے ساتھ تردید کرتا ہے کہ

"لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ" [۱]

کوئی آنکھ اُسے دیکھ نہیں سکتی۔

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

"لَنْ تَرَانِيْ" [۲]

''تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔'' اور ہم جانتے ہیں کہ ''لن'' کا لفظ ابدی نفی کے لیے آتا ہے۔

خطبۂ اِشباح میں یہ مسئلہ وَضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے، جیسا کہ امیر المؤمنینؑ فرماتے ہیں:

"وَالرَّادِعُ اَنَاسِيَّ الْاَبْصارِ عَنْ اَنْ تَنالَهُ اَوْ تُدْرِكَهُ اَوْ تُبْصِرَهُ"

''وہ جس نے لوگوں کی آنکھوں کو اپنی پاک ذات کے مشاہدے اور اُس تک پہنچنے سے باز رکھا۔'' [۳]

ایک اور خطبے میں اپنے فصیح وبلیغ بیان میں فرماتے ہیں:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَا تُدْرِكُهُ الشَّوَاهِدُ وَلَا تَحْوِيْهِ الْمَشَاهِدُ وَلَا تَرَاهُ النَّوَاظِرُ وَلَا تَحْجُبُهُ السَّوَاتِرُ" [۴]

تمام تعریف اُس خدا کے لیے سزاوار ہے کہ جسے حواس درک نہیں کر سکتے اور کوئی جگہ اُسے اپنے آپ میں سما نہیں سکتی اور پردے اُسے چھپا نہیں سکتے۔ عقائد کے علاوہ یہ موضوع ویسے بھی خلافِ عَقل ہے، کیونکہ اگر خدا دیکھے جانے کے قابل ہو تو یقیناً وہ جسم اور جگہ اور سمت میں مقید ہوگا اور اس کا نتیجہ محدود ہونا اور قابلِ تغیر ہونا ہے اور اس طرح وہ واجب الوجود کی بلندی سے نیچے آ کر ممکن الوجود کہلائے گا۔ اس مقام پر امیر المؤمنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہما السلام کی بیان شدہ تعبیرات چاند، سورج کی طرح چمک رہی ہیں اور حقائق کے چہرے روشن کرتی ہیں اور باطل اور خرافات کو نابود کر دیتی ہیں اور ہمیں توحید خدا کو پہچاننے کا سب سے دَقیق، سب سے حسین اور سب سے پیارا درس دیتی ہیں۔

جیسا کہ ہوتا آ رہا ہے کہ افراط کرنے والے گروہ کے مقابلے میں تفریط کرنے والے خُود نمائی کرتے ہیں۔ تشبیہ کے

[۱] سورۂ انعام، آیت ۱۰۳
[۲] سورۂ اعراف، آیت ۱۴۳
[۳] نہج البلاغہ، خطبہ ۹۱
[۴] نہج البلاغہ خطبہ ۱۸۵

قائل حضرات خدا کو جسم اور جسمانیات کی حد تک نیچے لے آئے ہیں، جبکہ کچھ لوگوں نے بالکل ہی اُلٹا راستہ چُن لیا، یعنی وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا کو پہچاننا بالکل ناممکن ہے اور نہ اُس کی ذات کی گہرائیوں کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ہی اُس کی صفات کو سمجھ سکتے ہیں اور ہم خدا کی صفات کے بارے میں مختصر سے مفہوم کے سوا کچھ بھی نہیں سمجھ سکتے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ عالم ہے تو ہم اتنا ہی سمجھ سکتے ہیں کہ وہ جاہل نہیں ہے۔ مگر اُس کے عالم ہونے کا کوئی مفہوم مطلقاً ہمارے علم میں نہیں آ سکتا، اس طرح یہ گروہ انسان کے فخر کا باعث ہونے والی سب سے بڑی چیز جو کہ معرفتِ خدا ہے، ضائع کر بیٹھا ہے۔ اور اس گروہ نے سراسر ظلمت و تاریکی کے راستے پر قدم رکھا ہے اور قرآن مجید کی تعلیمات کے خِلاف ہے۔ ہم اس گفتگو کو نہج البلاغہ کی ایک آسان تعبیر پر ختم کرتے ہیں، کہ مولاؑ نے فرمایا:

"لَمْ يُطْلِعِ الْعُقُوْلَ عَلٰى تَحْدِيْدِ صِفَتِهِ وَ لَمْ يَحْجُبْهَا عَنْ وَاجِبِ مَعْرِفَتِهِ فَهُوَ الَّذِيْ تَشْهَدُ لَهُ أَعْلَامُ الْوُجُوْدِ عَلٰى إِقْرَارِ قَلْبِ ذِي الْجُحُوْدِ تَعَالَى اللهُ عَمَّا يَقُوْلُ الْمُشَبِّهُوْنَ بِهِ وَ الْجَاحِدُوْنَ لَهُ عُلُوّاً كَبِيْراً"۔[1]

اُس نے عقلوں اور ذہنوں کو اپنی صفات سے آگاہ نہیں کیا، اِس کے ساتھ ساتھ اُنہیں اپنی معرفت اور شناخت کی بقدرِ ضرورت آگاہی سے رُوکا بھی نہیں، وہی ہے جس کی نشانیوں نے منکروں کے دلوں کو اُس کا اِقرار کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ جی ہاں وہ تشبیہ دینے والوں کی باتوں سے کہیں بُلند تر ہے۔ یعنی وہ لوگ جو اُسے مخلوق سے تشبیہ دیتے ہیں اور منکر لوگ یا وہ جو ایمان ہی نہیں لائے، یا وہ جو اُس کی شناخت کو غیر ممکن جانتے ہیں۔

خلاصۂ کلام

سیدھی راہ پانے کا بہترین طریقہ معرفت اور شناختِ پروردگار ہے، جو افراط اور تفریط کا درمیانی راستہ ہے یعنی تشبیہ اور تعطیل سے خالی ہے، جیسا کہ مولاؑ کے قول میں ذکر ہوا۔ صفاتِ الٰہی کی کیفیت اور اُس کی معرفت کا صحیح راستہ، نہج البلاغہ کے دوسرے خطبوں میں نہایت آسان، سلیس اور عام فہم تعبیرات کے ساتھ بتایا گیا ہے، اُن کا ذکر اُن کے موقع و محل پر کیا جائے گا۔

۳۔ اُس کی پاک ذات سے حدوثِ ذاتی اور زمانی کی نفی کرنا

جو تعبیرات اس مقام پر ذکر کی گئی ہیں، اُن سے یہ پتا چلتا ہے کہ اُس کی پاک ذات، حدوثِ ذاتی اور حدوثِ زمانی

---

[1] نہج البلاغہ: خطبہ ۴۹

سے بھی پاک ہے۔ حدوثِ زمانی سے مُراد یہ ہے کہ ایک شے کسی وقت وجود میں آئے، یعنی یہ کہا جائے کہ کسی زمانے میں اس کا وجود نہ ہو اور بعد میں وجود میں آئے۔ اور یہ معنی مادّی دنیا کے بننے کے بعد ہی تصور کیے جا سکتے ہیں، کیوں کہ جہانِ مادّہ (مادّی دُنیا) کے خلق ہونے کے بعد زمانہ خلق ہوا اور اُس کے بعد ہی حدوثِ زمانی اور عدمِ زمانی کا مفہوم سامنے آئے گا۔ مگر خدا مادّی دنیا اور اس کے زمانے دونوں کی تخلیق سے پہلے موجود تھا۔ وہ زمانے سے وجود میں نہیں آیا، جبکہ حدوثِ ذاتی سے مراد یہ ہے کہ مادّی دنیا سے ہٹ کر یہ کہا جائے کہ کوئی چیز اپنی ذات میں خود بخود وجود میں نہیں آئی ہے، بلکہ اُس کی ذات کسی اور ذات کے ہونے کی وجہ سے ہے۔ یعنی اُس کا وجود کسی اور ذات سے اس طرح وابستہ ہے کہ وہ ہے تو یہ ہے اور اگر وہ نہیں رہا تو یہ نہیں رہے گا۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ پروردگارِ عالم کی پاک ذات کا ان دونوں حدوث سے کوئی تعلق نہیں، کیوں کہ وہ واجب الوجود ہے، وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، بلکہ اُس کا وجود کسی کے سبب سے نہیں وہ خود عین ہستی اور عین ذات ہے۔

۴۔ خداوند عالم کے لیے لفظ ''موجود'' کا استعمال

کیا "موجود" کا لفظ خدا کے لیے استعمال کرنا ٹھیک ہے؟ اوپر بیان کی گئی تعبیر سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس تعبیر کا خدا کے لیے استعمال کرنا غلط نہیں ہے، جیسا کہ فرمایا: "مَوْجُودٌ لَا عَنْ عَدَمٍ" وہ وجود رکھتا ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ پہلے کسی وقت میں نہیں تھا، جب کہ اس لفظ کو در حقیقت دیکھا جائے تو یہ اسم مفعول کا صیغہ ہے اور اس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ کسی اور نے اُسے ہستی اور وجود بخشا ہے، مگر یہ لفظ یہاں اس معنی میں استعمال نہیں ہوگا، کیوں کہ یہ بات اُس کی پاک ذات سے بَعید ہے کہ اُسے کوئی وجود بخشے، بلکہ یہاں موجود کا مفہوم وجود رکھنے والے کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ نہج البلاغہ کی بعض شروح میں اس بات کی وضاحت کچھ یوں کی گئی ہے کہ ایسا موجود، جو ماہیاتِ ممکنہ سے برتر ہے اور اُس نے وجود کا لفظ اپنی ذات سے مخصوص کر لیا ہے۔ بعض اوقات اُسے موجود کہا جاتا ہے مگر، یہ خود وجود اور ہستی رکھنے والے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ [۱] یہ تعبیر اُصولِ کافی کی بعض روایات میں بھی اِسی مقصد سے ذکر ہوئی ہے۔ [۲]

چوتھا حصّہ

أَنْشَأَ الْخَلْقَ إِنْشَاءً وَ ابْتَدَأَهُ ابْتِدَاءً بِلَا رَوِيَّةٍ أَجَالَهَا وَ لَا تَجْرِبَةٍ اسْتَفَادَهَا وَ لَا حَرَكَةٍ أَحْدَثَهَا وَ لَا هَمَامَةِ نَفْسٍ اضْطَرَبَ فِيهَا أَحَالَ الْأَشْيَاءَ لِأَوْقَاتِهَا وَ لَاءَمَ لَأَمَ بَيْنَ مُخْتَلِفَاتِهَا وَ

---

[۱] مفتاح السعادۃ فی شرح نہج البلاغہ جلد نمبر ا صفحہ ۱۳۹

[۲] اصولِ کافی۔ جلد ا، باب ادنی المعرفۃ، حدیث ا۔ اور جلد ا، باب النہی عن الصفۃ، حدیث ا، اور جلد ا، باب جوامع التوحید، حدیث ۴۔

غَرَّزَ غَرَائِزَهَا وَ أَلْزَمَهَا أَشْبَاحَهَا عَالِماً بِهَا قَبْلَ ابْتِدَائِهَا مُحِيطاً بِحُدُودِهَا وَ انْتِهَائِهَا عَارِفاً بِقَرَائِنِهَا وَ أَحْنَائِهَا.

اُس نے مخلوقات کو از غیب ایجاد کیا اور ان کی تخلیق کی ابتدا کی بغیر کسی فکر کی جولانی کے اور بغیر کسی تجربے سے فائدہ اٹھائے ہوئے یا حرکت کی ایجاد کیے ہوئے یا نفس کے افکار کی الجھن میں پڑے ہوئے۔ تمام اشیاء کو ان کے اوقات کے حوالے کر دیا اور پھر ان کے اختلافات میں تناسب پیدا کر دیا۔ سب کی طبیعتیں مقرر کر دیں اور پھر انہیں شکلیں عطا کر دیں۔ اسے یہ تمام باتیں ایجاد سے پہلے معلوم تھیں اور وہ ان کی حدود اور ان کی انتہا کو خوب جانتا تھا۔ اُسے ہر شے کے ذاتی اطراف کا بھی علم تھا اور اس کے ساتھ شامل ہو جانے والی اشیاء کا بھی علم تھا۔

شرح وتفسیر

دنیا کی تخلیق سے گفتگو کا آغاز

جو کچھ اب تک اس انتہائی اہم خطبے میں ذکر ہوا، وہ معرفتِ الٰہی کے بارے میں گہرے اور پُرمعنی اِشارات ،مطالب اور مفاہیم تھے، جو انسانی معرفت کا سب سے پہلا مرحلہ ہے۔ اور اس کے بعد دنیا اور جہانِ عالم کی تخلیق اور خلقت کے آغاز اور عجائب خلقتِ زمین و آسمان سے متعلق ہے۔ اگر چہ یہ صفاتِ خدا سے متعلق ایک اختتامی کلام اور خلاصۂ کلام بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ ابتدا میں مولا علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَنْشَأَ[1] الْخَلْقَ اِنْشَاءً وَابْتَدَأَهُ اِبْتِدَاءً، لَارَوِيَّةٍ[2] أَجَالَهَا[3] وَلَا تَجْرِبَةٍ اِسْتَفَادَهَا، نَفْسٍ اضْطَرَبَ فِيْهَا"

اُس نے تخلیق کو، بغیر کسی غور و فکر اور بغیر کسی تجربے کی ضرورت کے، بغیر کسی حرکت کو ایجاد کیے اور نفس کے افکار کی الجھنوں میں پڑے بغیر شروع کیا۔"

اس مقام پر امامؑ نے مخلوقات کے کاموں سے اللہ کے کاموں کو بالکل علیحدہ شمار کیا ہے، کیوں کہ مثال کے طور پر جب

---

[1] اَنْشَأَ، کا لفظ، اِنشاء، سے آیا ہے اور اس کے کئی مختلف معانی ہیں مگر یہ بات واضح ہے کہ یہاں پر ایجاد کے معنی میں ذکر ہوا ہے۔

[2] رویۃ، کا لفظ مقائیس اللغۃ کے مُطابق سیراب ہونے کے معنی میں ہے مگر غور و فکر اور خصوصی توجّہ کے معنی میں بھی آتا ہے۔ گویا اپنی فکر کو اُس مسئلے سے سیراب کرنا، یا مسئلے کو اپنے غور و فکر سے سیراب کرنا اور غور و فکر کا حق ادا کر دینا۔

[3] أَجَالَ، کا لفظ "جَولان" سے آیا ہے جس کا مطلب حرکت کرنا اور گردش کرنا ہے۔

کبھی کوئی انسان کوئی کام انجام دیتا ہے اور اگر وہ کام اُس سے پہلے کوئی سابقہ نہ رکھتا ہو، یعنی اُس سے پہلے کبھی نہ کیا گیا ہو، تو اُس کے بارے میں اُسے غور و فکر سے کام لینا پڑتا ہے اور وہ اس پر خصوصی توجّہ دیتا ہے۔ اور اگر اِس سے پہلے کبھی یہ کام انجام دے چکا ہوتا، تو وہ اپنے یا دوسروں کے تجربوں سے استفادہ کرتا اور کبھی اُس کے ذہن میں کچھ فکری حرکات پیدا ہوتی ہیں، تو اس مسئلے کی باریکیوں پر اور نتائج پر غور کرتا ہے، تاکہ اُن سے کوئی نتیجہ نکلے اور بعض اوقات تردّد کا شکار ہو جاتا ہے اور پھر بالآخر یک طرفہ فیصلے کے بعد اِس کام کو انجام دیتا ہے۔ ان چاروں حالتوں میں سے کسی ایک کا بھی خداوند عالم کی پاک ذات سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ کسی بھی شے کو خلق کرتے وقت نہ اُس پر غور و فکر کرنے کا محتاج ہے نہ کسی تجربے کا، نہ فکری حرکت اور ذہنی تگ و دو کا محتاج ہے اور نہ ہی کسی تردد اور اضطراب و پریشانی کا۔ گویا اِدھر ارادہ کیا اور اُدھر وہ شے خَلق ہو گئی جو کبھی تھی ہی نہیں۔

"اِنَّمَآ اَمۡرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيۡـئًا اَنۡ يَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ"

''اس کا حکم تو ایسا ہے کہ جیسے ہی وہ کسی چیز کو چاہتا ہے تو اُسے کہتا ہے کہ ہو جا، اور وہ فوراً ہو جاتی ہے۔'' [۱]

دوسری تعبیر کے مطابق کسی کام کی انجام دہی میں چار حالتیں اُن کے لیے ہیں، جن کا علم اور قُدرت محدود ہے اور اُس کا لازمہ بنتا ہے کہ وہ غور و فکر اور تجربے یا اضطرابی کیفیت اور تردّد کا شکار بھی ہوں، مگر وہ جس کا علم و اقتدار لامحدود اور بے انتہا ہے، وہ خلقت کے وقت ان حالتوں میں سے کسی کا بھی شکار نہیں ہو سکتا۔ جو کچھ اوپر بیان کیا گیا اُس سے بخوبی پتا چلتا ہے کہ یہاں پر حرکت سے مراد وہی فکری اور اندرونی ذہنی حرکت ہے۔

مگر بعض مفسّرین کے کلام میں یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ حرکت سے مراد جسمانی اور خارجی (بیرونی) حرکت ہے، جس کا لازمہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جسم بھی رکھتا ہو اور خداوند عالم جسم اور جسمانیات سے کہیں بلند و بالاتر ہے۔ مگر پہلا مطلب زیادہ مُناسب لگتا ہے کیوں کہ اوپر کی عبارت میں جو تین حالتیں اس کے اوّل و آخر بیان کی گئی ہیں، وہ سب کی سب فیصلہ کرنے اور غور و فکر کرنے سے متعلق ہیں۔ مختصر یہ کہ خداوندِ عالم کے افعال، بندوں کے افعال سے کلّی طور پر جدا ہیں، کیوں کہ وہ نظامِ خلقت سے بخوبی آگاہ اور ہر چیز پر اپنی مکمل دسترس اور قدرتِ کامل رکھتا ہے، جس کے باعث حتمی اور اٹل فیصلہ کرتا ہے اور کسی بھی قسم کے تردّد اور تجربے کی ضرورت کے بغیر موجودات کو لباسِ وجود پہنا دیتا ہے۔ چناں چہ خلقت کے آغاز میں بھی ایسا تھا اور اس کے بعد بھی ایسا ہی ہوگا۔ اُس کے بعد موجوداتِ عالم کی خلقت اور اُن کی پیدائش کے معاملے میں پروردگارِ عالم کی خاص تدبیر اور دَقیق نظام کی جانب مولا علیؑ اشارہ فرماتے ہیں:

"اَحَالَ الۡاَشۡيَآءَ لِاَوۡقَاتِهَا"

''خدا نے ہر موجود کی پیدائش کو اُس کے خاص وقت پر مقرر کر دیا۔'' (کیونکہ اُس کی پیدائش کو بتدریج اور ایک

[۱] سورۂ یٰسین: آیت نمبر ۸۲

مخصوص وقت گزرنے کے ساتھ مقرر کیا، تاکہ وہ اپنی عظمت، اِقتدار اور تدبیر کو مزید آشکار کر سکے)۔

وقت کے تقرر کا اشیا کی خلقت میں کیا دخل ہے، اس کی وضاحت فرمانے کے بعد اشیاء کے خاص داخلی اور ترکیبی نظام کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"وَلَاءَمَ بَيْنَ مُخْتَلِفَاتِهَا" [1]

"اُس نے مختلف موجودات کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا اور "متضاد" اور مختلف اشیا کے درمیان ہم آہنگی قرار دی۔"

یہ بھی قدرت کے عجائبات میں سے ہے کہ خداوند متعال نے مختلف موجودات (مخلوقات) کو ایک دوسرے سے ایسے جوڑ دیا تھا کہ گویا سب کے سب ایک ہیں۔ ٹھنڈا اور گرم، اندھیرا اور اُجالا، موت اور زندگی، پانی اور آگ، سب کو ایک دوسرے سے جوڑ رکھا ہے، ہرے اور سرسبز درخت سے آگ پیدا کی، جب کہ انسان، حیوان، گھاس پھوس وغیرہ کے وجود کو بالکل مختلف مواد اور تراکیب سے خلق کیا اور مختلف طبائع عطا کیے، یہاں تک کہ روح وجسم کے درمیان بھی جو دو بالکل علیحدہ وجود ہیں، ان میں سے ایک کو "مجرد، نورانی" اور لطیف مادّے سے بنایا جب کہ دوسری کو ایک تاریک اور کمتر مادّے سے بنایا اور ان میں ایک گہرا رابطہ بھی برقرار رکھا۔ جب کہ یہ سب بالکل مختلف اجزا، بلکہ مختلف جسم ورُوح سے بنے ہوئے ہیں۔

پھر فرماتے ہیں:

"وَغَرَّزَ [2] غَرَائِزَهَا"

"خداوند عالم نے ان میں ہر ایک کی طبیعتیں اور فِطرتیں مقرر فرمائیں اور ہر ایک کو اُس کی مخصوص اور علیحدہ فطرت اور احساس بخشا۔"

یہ اللہ کی حکمتوں میں سے ہے کہ اُس نے ہر مخلوق سے جیسی توقع رکھی جاتی ہے، ایسا ہی مزاج اُس کی فطرت میں رکھ دیا تاکہ کسی انگیزے اور محرک کا محتاج نہ ہو اور خود اپنے راستے پر اپنے اندر سے ملنے والی ہدایت کے مطابق گامزن رہے اور اگر یہ حس نہ ہوتی تو اشیا کے آثار میں دوام نہ ہوتا اور بے نظمی اُن پر حاکم ہوتی۔ آج اِنسان اور دوسری مخلوقات کی ذاتی خصلتوں کو دو مختلف تعبیروں سے واضح کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات اسے فطرت کہا جاتا ہے، یعنی خداشناسی انسان کی فطرت میں ہے اور بعض

---

[1] لام، اور لائم، کے الفاظ لائم، کے مادّے سے بنے ہیں، جن کے معنی ہیں، جمع کرنا، اصلاح کرنا، کسی چیز کا دوسری چیز سے مِلا دینا، جوڑ دینا، اُس میں ضَمّ کر دینا۔ اسی وجہ سے زِرَہ کو لاَمَة، بروزنِ رحمة کہتے ہیں، کیونکہ اُس کے حلقے ایک دوسرے میں جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

[2] غَرَّزَ، کا لفظ "غَرز" کے مادّے سے آیا ہے جو "قَرض" کے وزن پر ہے دراصل یہ لفظ سوئی چبھونے، گھسانے اور داخل کرنے کے معنی میں آتا ہے، اس کے بعد یہ لفظ انسان اور دوسری موجودات کی طبیعت اور فطرت کے لیے استعمال ہوا تو گویا طبیعتیں اور فطرتیں، ان پودوں کی طرح ہیں جنہیں انسان کے وجود کی زمین میں بویا گیا ہے۔

اوقات اِسے غریزے کا نام دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر کہا جاتا ہے کہ انسان جنسی غریزہ رکھتا ہے، یا یہ کہا جاتا ہے کہ حیوانات کی حرکات وسکنات بعض اوقات غریزے کی بنیاد پر ہوتی ہیں۔ یہ درحقیقت وہ اِصطلاح ہے، جسے دانش وروں نے انتخاب کیا ہے۔ کہ ان میں سے ایک فکری بنیادیں رکھتی ہے یعنی فطرت اور دوسری غیر فکری اور احساساتی وجذباتی، عاطفی بنیادوں پر اُستوار ہے یعنی غریزہ، مگر لغوی معنی میں یہ دونوں خلقت اور پیدائش کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

اس عبارت کے آخری جملے میں فرماتے ہیں:

"اَلْزَمَهَا أَشْبَاحَهَا"

اُن کی مخصوص صفات کو اُن کے ساتھ کر دیا۔

کچھ افراد من جملہ ''ابنِ ابی الحدید'' کہتے ہیں کہ یہ جملہ اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ پروردگارِ عالم نے اِن غریزوں کو موجودات میں ثابت اور مستحکم قرار دیا ہے، لہٰذا "اَلْزَمَهَا" کی ضمیر غرائز کی طرف لوٹ رہی ہے۔ چناں چہ مذکورہ جملہ موجودات کے غرائز ثابت ہونے کی تاکید ہے، مگر بعض کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام موجودات کو مخصوص شناخت کے ساتھ خلق کیا ہے، یعنی خداوندِ عالم نے ہر مخلوق کو کچھ انوکھی خصوصیات سے نوازا ہے، یہ مخلوقات علمِ الٰہی میں کلّیت رکھتی ہیں اور ظاہری طور پر جزئیات اور اشخاص کی شکل میں وجود میں آئی ہیں۔

اس بنا پر "اَلْزَمَهَا" کی ضمیر اَشیا کی طرف لوٹ رہی ہے اور بعض شارحین نے ان دونوں تفسیروں کا احتمال دیا ہے۔ مگر جیسا کہ پہلی تفسیر میں ضمیروں کی مطابقت کو محفوظ نہیں رکھا گیا اور یہ کہ اس تفسیر کے مطابق جملہ تاکیدی شمار ہوگا، اور کوئی نیا مطلب سامنے نہیں آئے گا، لہٰذا دوسری تفسیر زیادہ مناسب اور صحیح ہے۔ مزید وضاحت: کہ خدا نے ہر مخلوق کو دو قسم کی خصوصیات سے نوازا ہے۔ پہلی وہ خصوصیات جو اس کی ذات کے اندر ہیں اور حضرت امام علیؑ نے اُنہیں غرائز کے نام سے تعبیر فرمایا ہے۔

اور دوسری وہ خصوصیات جو ظاہری پہلو رکھتی ہیں، جیسے کہ زمان ومکان اور دیگر جزئیات جنہیں مولاؑ نے "اَلْزَمَهَا أَشْبَاحَهَا" کے جملے سے تعبیر فرمایا ہے۔ اور اس طرح سے اُس نے اپنی حکمت بالغہ سے تمام موجودات کے لیے اندرونی اور بیرونی خصوصیات مُقرر فرمائیں تا کہ ہر مخلوق اپنے اپنے خاص وظائف اور کاموں کو انجام دے اور اُس کی دوسری مخلوقات سے الگ ایک پہچان ہو۔[۱]

---

[۱] اَشْبَاحْ" کا لفظ "شَبَحْ" کی جمع ہے۔ بہت سے اہلِ لغت کی وضاحت کے مطابق، دراصل یہ شخص کے معنی میں آتا ہے، اور آشکار یا ظاہر اور نمایاں ہونے والی چیز کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور آج کل یہ لفظ کسی ایسی آدھی نظر آنے والی شے کو کہا جاتا ہے جو اچانک پوری طرح سے ظاہر اور آشکار ہو جائے، یہاں پر "شَبَحْ" اِسی معنی میں ہے۔

نکتہ

موجوداتِ عالم کی فکری اور تکوینی ہدایت

مذکورہ جملوں میں ایک ایسے نکتے کی جانب اِشارہ ہے، جس کی قرآن مجید میں بھی مکرّر تاکید ہے۔ اور وہ یہ کہ اس عالم کی تمام تر موجودات ومخلوقات، ایک خاص وقت کی بندش میں ہیں۔ آپس میں تمام اِختلافات اور تضاد کے باوجود ایک دوسرے سے میل جول رکھتی ہیں اور ایک دوسرے کی تکمیل اور ضرورتوں کو پورا کرنے کا باعث ہیں اور ہمیشہ اپنی ذات کے اندرونی اور بیرونی نظم کے مطابق ہدایت پاتے ہوئے ایک ہدف کے ساتھ کارواں کی صورت میں منزلِ آخر کی طرف رواں دواں ہیں اور کبھی اپنے راستے سے نہیں بھٹکتیں اور مستقل اپنے مقصد کی جانب بڑھتی رہتی ہیں۔

گرمیوں اور بہار کے موسم میں درختوں کا پھل پھول جانا، اور سردیوں میں سُوکھ کے خشک ہوجانا، سورج کا بارہ بُرجوں میں حرکت کرنا، نظامِ شب وروز کی کیفیت اور زمین کا اپنے گرد گھومنا، اور اسی طرح سے انسان کی اندرونی اور بیرونی قوتیں یہ سب کی سب اللہ کی تکوینی ہدایت کی گواہ ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید حضرت مُوسیٰ علیہ السلام کی زبانی بیان کرتا ہے۔

"رَبُّنَا الَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی"

''ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اُس کے مخصوص انداز سے خَلق کیا پھر اُس کی ہدایت کی۔''[۱]

اور فرمایا:

"فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا"

''توحید اور اسلام خدا کی وہ فطرت ہے جس پر اُس نے انسانوں کو پیدا کیا۔''[۲]

اور فرماتا ہے:

"وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ"

''ہر شے کے خزانے ہمارے پاس ہیں اور ہم کسی چیز کو سوائے اُس کی خاص مقدار (اور خاص نظم وحساب) کے علاوہ نازل نہیں کرتے۔''[۳]

---

[۱] سورۂ طٰہٰ: آیت ۵۰

[۲] سورۂ روم: آیت ۳۰

[۳] سورۂ حجر: آیت ۲۱

درحقیقت یہ سب موضوعات اِس عالم میں خداوند عالم کی عظیم نشانیوں کو بیان کرتے ہیں، جن پر انسان جتنا زیادہ سے زیادہ غور کرے، اُتنا زیادہ ہدایتِ تکوینی اور نظم وضبط اور وقت کی بندش اور مخلوقات کی آپس میں محبت اور ضرورت مند ہونے وغیرہ جیسے مسائل سے آگاہ ہوتا جائے گا۔ حضرت علی علیہ السلام مزید فرماتے ہیں:

"عَالِماً بِهَا قَبْلَ اِبْتِدَائِهَا مُحِيطاً بِحُدُودِهَا وَانْتِهَائِهَا عَارِفاً بِقَرَائِنِهَا [۱] وَأَحْنَائِهَا [۲]، [۳]

''ان سب چیزوں سے وہ اُس وقت بھی آگاہ تھا جب اُنہیں پیدا بھی نہ کیا تھا اور اُن کی تمام حُدود اور ضرورتوں سے باخبر تھا۔''

یہ تین جملے گویا درحقیقت پچھلے جملوں کے لیے دلیل اور وضاحت کے طور پر یہاں لائے گئے ہیں۔ کیونکہ جو ذات ہر مخلوق کو اُس کے مناسب وقت میں ایجاد کرنا چاہتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ مختلف قسم کی اشیا اور مخلوقات کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر ایک دوسرے کی ضرورت بنانا چاہتی ہے اور اُن کے اندرونی غریزوں اور بیرونی لوازمات کو اپنی اپنی جگہ رکھنا چاہتی ہو، ایک طرف تو اُس ذات کو کامل علم اور واقفیت کی ضرورت ہے اور دوسری جانب اُس کا ہر شے پر مکمل اِحاطہ اور قدرتِ تامّہ اور کاملہ رکھنا بھی ضروری ہے۔ اس حوالے سے حضرت مولا علیؑ فرماتے ہیں کہ:

"عَالِماً بِهَا قَبْلَ اِبْتِدَائِهَا ----"

''خداوندِ عالم تمام اشیاء کو خلق کرنے سے پہلے، اُن سے آگاہ تھا اور اُن کی تمام تر حدود اور نتائج سے واقف تھا اور وہ اِن سب پر مکمل قدرت وتوانائی رکھتا تھا۔''

نہ صرف یہ کہ وہ اُن سے آگاہ تھا، بلکہ وہ اُن کے تمام تر نتائج، اُن کے حدود اور مختلف پہلوؤں سے بھی باخبر تھا۔ درحقیقت جو بھی تمام معاملات سے آگاہ ہو اور اُن کی ضرورت کے مطابق تمام قدرت وتوانائی بھی رکھتا ہو، وہ اِس بات پر قادِر ہے کہ ہر چیز کو اُس کی جگہ قرار دے اور جس کی جو بھی ضرورت ہے، وہ پوری کرے اور وہ اُس کی زندگی اور موت کے معاملات میں اُس کی ہدایت بھی کرسکتا ہے۔

---

[۱] قَرائِن کا لفظ قرینہ کی جمع ہے، جو کہ ساتھ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی بنا پر دوست، ساتھی، شوہر کو بھی قرینہ کہا جاتا ہے۔ صحاح، قاموس اور دیگر لغت کی کتب میں بعض شارحین جیسے کہ ابن ابی الحدید وغیرہ، قرائن کو قرینۃ کی جمع کہتے ہیں ''بروزنِ معونۃ'' یعنی نفس کے معنیٰ میں لیا ہے۔ مگر اس جملے کی تمام تعبیرات کو دیگر جملوں کی روشنی میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ پہلا مطلب زیادہ مناسب ہے۔

[۲] لسان العرب اور مقائیس اللغۃ کے مطابق ''اَحْنا'' کا لفظ حِنْو بروزنِ فعل اور حَنْوۃٌ، بروزنِ حرف اُس چیز کو کہا جاتا ہے جس میں کوئی ٹیڑھا پن اور کوئی پیچیدگی اور خم پایا جاتا ہو۔ جیسے کہ ہڈی، خاص طور پر جسم کی گول اور خم ہونے والی ہڈیاں یا اس جیسی اور چیزیں۔ اس کے علاوہ جوانب کے معنی میں بھی آیا ہے، کیونکہ اطراف اور جوانب بھی اکثر اوقات پیچ وخم والے ہوتے ہیں۔

[۳] اس جملے میں موجود ضمیریں اشیاء کی طرف پلٹتی ہیں، نہ کہ غرائز کی طرف۔

چند نکات

۱-خدا پر لفظ "عارف" کا اطلاق

نہج البلاغہ کے بعض مفسّرین اس مسئلے میں تردّد کا شکار ہیں کہ آیا خداوند عالم کی "عارف" کے لفظ سے توصیف کی جاسکتی ہے؟ اس تردّد کا سرچشمہ درحقیقت دو چیزیں ہیں:

پہلی بات یہ کہ مفردات میں راغب کے مطابق معرفت اور عرفان کا مطلب کسی چیز کو تفکر اور تدبر کے ساتھ دَرک کرنا ہے یا دوسرے الفاظ میں، معرفت اُس علم کو کہا جاتا ہے جو کہ محدود ہو اور تفکر و سوچ بچار کرنے سے حاصل ہو۔ جب کہ یہ بات واضح ہے کہ خدا کا علم ایسا نہیں، اور دوسرے یہ کہ حضرت رسولِ خداؐ سے ایک حدیث نقل ہوئی ہے جس میں آپؐ فرماتے ہیں:

"اِنَّ لَهُ (تَعَالٰی) تِسۡعَةً وَتِسۡعِيۡنَ اِسۡمًا مَنۡ اَحۡصَاهَا دَخَلَ الۡجَنَّةَ"

"خدا کے ننانوے نام ہیں، جو انہیں شمار کرے اور ان پر ایمان اور ان کی معرفت بھی رکھے گا وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔"

ادھر علماء اس بات پر متفق ہیں کہ عارف کا لفظ اُن ننانوے ناموں میں نہیں ہے، مگر ایک سرسری مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ یہ لفظ اسلامی روایات میں کئی بار خداوند عالم کے لیے استعمال ہوا ہے اور نہج البلاغہ میں ایک مقام پر وصفی صورت میں اور ایک دوسرے مقام پر فعلی صورت میں ذِکر ہوا ہے، البتہ نہج البلاغہ کے علاوہ اصولِ کافی میں بھی کئی جگہوں پر استعمال ہوا ہے۔ [1]

چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ لفظ "معرفت" اگرچہ دراصل ایک محدود معنی کا حامل تھا اور فکر و تدبر کی ضرورت کے ساتھ تھا، مگر بعد میں کثرتِ استعمال کی وجہ سے مزید وسیع مفاہیم کے لیے استعمال ہونے لگا جو کہ ہر قسم کے علم و آگاہی پر مشتمل ہے اور فکر و تدبر سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اور وہ روایت جس میں خدا کے ۹۹ ناموں کے بارے میں ذکر ہے، تو اس روایت میں کہیں بھی اللہ کے ناموں کا صرف ۹۹ ناموں میں محدود ہونا ثابت نہیں، بلکہ یہ ننانوے نام تو درحقیقت اللہ کی برجستہ صفات اور اسمائے حسنیٰ ہیں اور بعض روایات میں اللہ کے ایک ہزار نام بتائے گئے ہیں۔ اور ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ حضرت علیؑ ابن

---

[1] ابنِ میثم اس موضوع کو ایک اعتراض کے طور پر ذکر کرتے ہیں کہ خدا کے نام ان ناموں سے کہیں زیادہ ہیں، جنہیں بیان کیا گیا ہے اور اس بات پر دلائل بھی دیئے ہیں۔ "شرحِ نہج البلاغہ، ابن میثم، جلد ۱، صفحہ ۱۳۷" یاد رہے کہ یہ حدیث درالمنثور سے صحیح بخاری اور مسلم اور مسند احمد، سنن ترمذی اور دیگر متعدد کتب میں ذکر ہوئی ہے۔ الدرالمنثور، جلد ۳، صفحہ ۱۴۷، پیامِ قرآن، جلد ۴، صفحہ ۴۶۔

ابی طالبؑ جو اَسماء وصفاتِ خداوندی کے بارے میں سب سے زیادہ آگاہ ہیں، انہوں نے اس نام اور اس جیسے ناموں کو اللہ کے لیے استعمال کیا ہے۔

۲۔ خلقت سے قبل مخلوقات کے بارے میں علم الٰہی

اعتقادی اور فلسفی مسائل میں سب سے زیادہ پیچیدہ مسئلہ ''مخلوقات کی تخلیق سے پہلے خدا کا اُن کے بارے میں علم'' کا مسئلہ ہے۔ ایک طرف تو ہم یہ بات جانتے ہیں کہ خداوند عالم مستقبل کے حالات اور حوادِث سے آگاہ ہے اور قرآن میں بھی متعدد بار اِس کی جانب اِشارہ ہوا ہے، دوسری جانب قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ علمِ خدا علمِ حصولی نہیں ہے، یعنی اشیاء کی شکل وصورت ذھنیہ اُس کی ذات میں منعکس نہیں ہوتی ہے، کیونکہ وہ مخلوقات جیسا ذہن نہیں رکھتا، اور اُس کا علم موجودات کی شکلوں کا تصور ذہن میں کرنے سے حاصل نہیں ہوتا، گویا مخلوقات کا وجود اُس کی نظر میں ہر وقت حاضر ہے، جبکہ یہ بھی معلوم ہے ان اشیاء کے بارے میں جو ابھی تک معرض وجود میں نہیں آئی ہیں علمِ حضوری کوئی معنی اور مفہوم نہیں رکھتا ہے یہاں تک کہ یہ اعتراض اُن اشیا کے بارے میں بھی ٹھیک ہوگا، جو ماضی میں معدوم ہو چکی ہیں۔

اگر ہم اُن اشیا کے بارے میں کچھ آگاہی رکھتے ہیں تو اس کی وجہ وہ واقعات وذہنی نقش وتصّورات ہیں، جو ہمارے ذہن میں اُن کے حوالے سے بسے ہوئے ہیں، مگر وہ پاک ذات جو قصّے اور واقعات یاد رکھنے کے لیے ذہن کا محتاج نہیں ہے، وہ کیسے اِن اشیاء سے آگاہ ہے؟ مثال کے طور پر فرعون اور اُس کے ساتھیوں کی شکلیں گل سڑھ چکی ہیں اور اُن کی تاریخ بھی گزر چکی ہے، ہم اُن کی صرف ایک خیالی تصویر یا ایک خاکہ اپنے ذہن میں بنا سکتے ہیں مگر جب وہ ذاتِ الٰہی کا علم ایسا نہیں ہے تو وہ اُن سے کیسے آگاہ رہ سکتا ہے؟[1] کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ماضی سے آگاہ نہیں ہے؟ یا مستقبل کی خبر نہیں رکھتا؟ ہرگز نہیں، تو پھر اگر وہ آگاہ ہے تو کیسے ہے؟ اِس پیچیدہ مسئلے نے علمائے کلام اور فلسفیوں کے درمیان ہلچل مچادی، اُنہوں نے اِس موضوع پر درج ذیل متعدد جوابات تیار کیے ہیں:

۱۔ خدا ہمیشہ اپنی پاک ذات سے جو کہ تمام اشیاء کی علت ہے، آگاہ ہے یا دوسرے لفظوں میں اُس کی ذات، اس کے حضور، بہترین حضور رکھتی ہے اور اس کا اپنی ذات کے بارے میں علم رکھنا درحقیقت عالمِ وجود کے تمام تر واقعات اور مخلوقات کے ایجاد ہونے سے پہلے اور ایجاد ہونے کے بعد اس کے علمِ اجمالی پر مشتمل ہے۔ اس کی وضاحت کچھ یوں ہوگی کہ اگر ہم تمام اشیاء کی علّت سے آگاہ ہوں تو یہ آگاہی خود بخود اُس کے نتیجے اور معلول سے آگاہی کا باعث بنے گی۔

کیونکہ ہر علّت اپنے معلول کے تمام تر کمالات اور اُس سے اوپر کے کمالات کو بھی اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس لیے

---

[1] اصولِ کافی، جلد ۱، صفحہ ۹۱، باب النسبہ، حدیث ۲، صفحہ ۱۸، باب حدوث الاسماء، حدیث ۲

خداوند عالم تمام اشیاء کی علّت ہے اور وہ اپنی ذات سے آگاہی رکھتا ہے اور تمام اشیاء سے بھی آگاہ ہے اور یہ درحقیقت تمام مخلوقات کی نسبت اِجمالی علم کے ذریعے علمِ تفصیلی کا انکشاف ہے۔

ایک اور طریقے سے اس بات کی وضاحت کی جاسکتی ہے۔ مثلاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ، گزشتہ واقعات وحادثات مکمل طور پر نیست ونابود نہیں ہوئے ہیں، بلکہ اُن کے آثار آج تک کے حادثات میں نظر آتے ہیں، اسی طرح آنے والے حادثات آج کے حادثات سے جدا نہیں بلکہ مکمل طور پر ان سے مربوط ہیں اور انہی سے جنم لیتے ہیں۔ اس طرح سے ماضی، حال اور مستقبل مل کر زنجیر کی طرح ایک مجموعے کو تخلیق کرتے ہیں، جس میں علّت ومعلول کی کڑی سے کڑی جڑی ہوئی ہے، جن میں سے ہر ایک کڑی کی آگاہی، گویا اگلی اور پچھلی کڑی سے آگاہی کا باعث ہے۔

بطور مثال اگر ہم بڑی باریکی سے پوری روئے زمین کے موسم اور موجودہ موسم کے سبب پیدائش کو جان لیں اور اس کی علّت ومعلول کے درمیان رابطے کی تمام جزئیات سے آگاہ ہوجائیں، تو ہم اس طرح آج سے ہزاروں سال پہلے اور بعد کے موسم کی کیفیت کا بھی پتا لگا سکتے ہیں، کیونکہ ماضی اور مستقبل کے موسم کی تفصیلات آج کے موسم میں موجود ہیں۔ آج، ماضی کی تصویر ہے، اور آنے والا کل، آج کی تصویر ہوگا۔ اور آج کی تمام تر جزئیات سے آگاہی، گزرے ہوئے کل اور آنے والے کل کے حادثات سے خود بخود آگاہ کردے گی۔ اب اگر ہم اس حقیقت کی طرف توجّہ کریں کہ خداوند عالم کل، آج اور آنے والے کل کے حادثات کا اصل سرچشمہ ہے اور وہ اپنی پاک ذات کے بارے میں علم رکھتا ہے اور خود کو خوب جانتا ہے، تو ہمیں یہ بھی ماننا ہی پڑے گا کہ وہ ماضی، حال اور مستقبل کے حادثات وواقعات سے بھی واقف ہوگا۔ بے شک ہر مخلوق کا اپنا ایک اثر ہے، جو خدا کے اِذن وحکم سے ہے، جسے وہ جب چاہے واپس لے سکتا ہے مگر اُس کی سنّت یہ ہے کہ وہ مخلوقات کو کچھ آثار اور خاصیتوں سے نوازتا ہے اور جب بھی چاہتا ہے اُن سے واپس لے لیتا ہے۔ [1]

۲۔ اِس سوال کے جواب کے لیے دوسری جو راہ اختیار کی جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ آج، کل، اور آنے والا کل، یہ تمام چیزیں ہمارے علم وآگاہی کے بارے میں تصوّر کی جاتی ہیں، کیونکہ ہم ایک محدود مخلوق ہیں مگر خداوند عالمین کے بارے میں جس کی ذات ایک لامحدود وجود ہے، گزرے ہوئے کل، آج، اور آنے والے کل کا تصوّر کوئی مفہوم نہیں رکھتا، بلکہ اُس کے سامنے تو تمام اشیاء اور تمام حادثات اپنے اپنے ظرف کے ساتھ اپنی تمام خصوصیات اور جزئیات کے ساتھ حاضر ہیں۔ اس

---

[1] جن لوگوں نے مذکورہ بالا اعتراض کو حل کرنے کے لیے یہ جواب تراشا ہے وہ ایک نئے سوال کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ اس بات کا لازمہ یہ بنتا ہے کہ خداوند عالم انگنت موجودات کے بارے میں قبل از تخلیق ان کی کثیر صفت کے ساتھ علم وآگاہی نہیں رکھتا تھا۔ کیونکہ اُس کی ذات میں کثرت نہیں ہے، دوسرے لفظوں میں اُس کا موجودات اور مخلوقات کے بارے میں علم، ان کے وجود سے پہلے اور وجود کے بعد کے بارے میں مختلف ہے۔ پہلے اِجمالی علم کی شکل میں تھا اور بعد میں تفصیلی علم کی شکل میں ہے اور تعجب کا مقام تو یہ ہے کہ اُن میں سے بعض نے اس فرق کو مان بھی لیا ہے۔

باریک اور دقت طلب بات کو ایک آسان سی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے، فرض کیجیے کہ ایک شخص ایک کمرے میں قید ہے اور اُس میں ایک چھوٹا سا سوراخ ہے، جو باہر کی طرف نکلا ہوا ہے۔ اُدھر اونٹوں کی ایک قطار اس سوراخ کے سامنے سے گزر رہی ہے تو یہ شخص پہلے ایک اُونٹ کے سر کو پھر گردن کو دیکھے گا پھر کُوہان اور پھر پیروں اور دُم کو دیکھے گا اور اس طرح باری باری دوسرے اُونٹوں کو دیکھے گا جو اس قطار میں ہیں۔ یہ سوراخ کے چھوٹا ہونے کی وجہ سے ہے کہ وہ پھر اپنے لیے ماضی، حال اور پھر مستقبل کا زائچہ بنائے گا، اور وہ شخص جو اس کمرے سے باہر چھت پر اور کھلی فضا میں کھڑا ہوا ہے وہ پورے بیابان کو ایک ساتھ دیکھ رہا ہے تو وہ اُونٹوں کی قطار کو ایک جگہ پر ایک ساتھ چلتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ (غور کیجیے)

پانچواں حصّہ

ثُمَّ أَنْشَأَ سُبْحَانَهُ فَتْقَ الْأَجْوَاءِ وَ شَقَّ الْأَرْجَاءِ وَ سَكَائِكَ الْهَوَاءِ

''اس کے بعد اُس نے فضا کی وسعتیں، اُس کے اطراف و اکناف اور ہواؤں کے طبقات ایجاد کیے۔''

شرح و تفسیر

آغازِ تخلیقِ عالم

زیرِ بحث موضوع کی طرف مولا علیؑ کا پہلا جملہ ہی راہنمائی کرتا ہے کہ فضا کی خلقت کیسے ہوئی، فرماتے ہیں:

ثُمَّ اَنْشَأَ سُبْحَانَهُ فَتْقَ [۱] الْاَجْوَاءِ [۲] وَشَقَّ [۳] الْاَرْجَاءِ [۴] وَسَكَائِكَ [۵] الْهَوَاءِ [۶]

''پھر خداوندِ سبحان نے فضا کے طبقات اور حصّوں کو ایک دوسرے سے الگ کیا اور فضا کو ایجاد کیا۔''

پہلے حصے میں فضا کو کھولنے کی جانب اشارہ فرمایا، اور دوسرے حصّے میں اُس کے اطراف و جوانب کو ایجاد کرنے اور تیسرے حصّے میں اُس کے طبقات کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ یہ تمام جملے اس بات کو واضح کر رہے ہیں کہ مادّی دنیا میں، سب سے پہلی تخلیق اس دنیا کی فضا کی ہوئی ہے، ایک ایسی فضا جس میں آسمانی کرّات اور کہکشاؤں کو قبول کرنے کی صلاحیت ہو۔ بالکل اُس کاغذ کے صفحے کی طرح جسے ایک ماہر مصوّر تصویر بنانے کے لیے تیار کرتا ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ لفظ ''ثُمّ'' اس جگہ تکوینی ترتیب کے معنی میں نہیں استعمال ہوا، بلکہ تاخیر بیان اور ترتیبِ بیان کے لیے استعمال ہوا ہے، کیونکہ پچھلے جملوں میں مختلف مخلوقات اور کائنات کی تخلیق کی جانب اشارہ ہو چکا ہے اور یقیناً ایسا نہیں ہوسکتا کہ فضا اور آسمانی کرّات اور زمین وغیرہ اُس کے بعد خلق کیے جائیں۔ درحقیقت پچھلی بحث میں تمام موجودات اور مخلوقات کی تخلیق کے بارے میں اجمالی و مختصر ذکر تھا اور اِس حصّے میں اُس بیان کی ایک نئی شرح اور تفصیل بیان کی جارہی ہے۔

بہرحال اس عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فضا مخلوقات میں سے ایک یا پہلی مخلوق ہے، جس کا عالمِ مادّہ سے تعلق

---

[۱] لفظ فَتقَ، مشق کے وزن پر ہے جو کہ دراصل کھولنے اور دو چیزوں کے درمیان فاصلے کے معنی میں آتا ہے۔ اور یہ رَتق کی ضد ہے، جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے، صبح کو فَتْیق کہا جاتا ہے کیونکہ آسمانوں کو چیرتے ہوئے ظاہر ہوجاتی ہے۔ اور لسانُ العرب کے مطابق اچھے فصیح اور سخن ور شخص کو فَتیقُ اللِّسان، کہا جاتا ہے کیونکہ اُس کی زبان کھلی ہوتی ہے۔

[۲] اَجواء کا لفظ جَوّ کی جمع ہے، اور بقول ''مفردات'' لسان عرب میں زمین و آسمان کے درمیان وسیع فضا کو (جو) کہا گیا ہے۔

[۳] شَقّ، کا لفظ کسی چیز میں شگاف (یا چیخ یا دراڑ) کے معنی میں آتا ہے اور اسی وجہ سے جب لوگوں میں اختلافات پیدا ہوجاتے ہیں اور وہ ایک دوسرے سے دور ہوجاتے ہیں تو اسے شقاق کہا جاتا ہے۔

[۴] ارجاء کا لفظ رَجا کی جمع ہے، ہمزہ کے بغیر، مقائیس اللغۃ کے مطابق کنویں کے اطراف یا کسی بھی چیز کے اطراف کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور جب، رَجاء ہمزہ کے ساتھ کہا جائے تو یہ اُمید کے معنی میں آتا ہے۔ بعض افراد، جیسے ''التحقیق'' کے مولّف یہ کہتے ہیں کہ اِس کا اصل مطلب یہ ہے کہ جب کسی چیز کے وقوع پزیر ہونے کی اُمید، اطراف و جَوانب میں نظر آتی ہے، تو ایسے اطراف و جوانب کو، رَجا، کہا جاتا ہے، بغیر ہمزہ۔

[۵] سکائك کا لفظ سُکا کہ، کی جمع اور خُلاصہ کے وزن پر ہے۔ لسانُ العرب کے مطابق اس کا مطلب وہ فضا ہے جو زمین و آسمان کے درمیان موجود ہے۔ اور ''ابن ابی الحدید'' کے مطابق فضا کے بالائی حصّوں کو کہا جاتا ہے۔

[۶] هواء، دراصل خالی ہونے اور سقوط کرنے، گر جانے کے معنی رکھتا ہے، ہر خالی چیز کو ھوا کہا جاتا ہے۔ مِن جملہ زمین و آسمان کے درمیان کی فضا کو ہوا کہا جاتا ہے۔ اور جو نفسانی خواہشات کے بناء پر نفس کو ھویٰ کہا جاتا ہے، اُس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دُنیا و آخرت میں سُقوط کا باعث بنتا ہے، مقائیس اللغۃ، مفردات، لسانُ العرب، اس لفظ کا غیر مرئی گیس کے لیے استعمال ہونا جیسے کہ آکسیجن وغیرہ جو ہمارے اطراف میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہے، ایک جدید استعمال ہے، جو اصل مطلب سے بھی تناسب رکھتا ہے۔ (اگرچہ بعض روایات میں یہ معنی بھی ذکر ہوئے ہیں)

ہے، مگر فلسفیوں اور متکلمین نے اِس بارے میں تردید کی ہے کہ آیا فضا ایک امرِ وجودی ہے یا عدمی؟ اور بعض کا کہنا ہے کہ جیسا کہ وقت، موجودات کی پیدائش اور اُن کی حرکت سے حاصل ہوتا ہے (کیونکہ وقت دراصل وہی حرکت کے اندازے کا قرینہ ہے) اِسی طرح سے مکان بھی مختلف اَجسام اور چیزوں کی پیدائش اور اُن کا ایک دوسرے سے مقائسہ کرنے سے حاصِل ہوتا ہے۔ گویا یہ تصوّر کرنا بہت مشکل ہے کہ جب پہلا جسم پیدا ہوا تھا، اُس وقت کوئی مکان موجود ہی نہ تھا، جس وقت ہم ایک چند منزلہ عمارت کی تعمیر کرتے ہیں، تو جس طرح وہ زمین پر کچھ جگہ گھیرتی ہے اُسی طرح سے فضا میں بھی کچھ جگہ گھیرتی ہے اور ہم جتنی بڑی عمارت بنائیں گے وہ اُتنی ہی بڑی فضا کو گھیرے گی۔

بہرحال ہم حضرت علی علیہ السلام کے کلام کے ظاہری مطلب پر اکتفا کرتے ہیں کہ حضرتؑ نے فرمایا، ''فضا اور اُس کے اطراف و جوانب خدا کی مخلوق ہیں'' اور بحث کو مزید طول دینے سے گُریز کرتے ہوئے اِس موضوع پر مناسب مقام میں بحث کریں گے۔

ایک نکتہ

کیا مادّی دنیا حادث ہے؟

مادّی دنیا حادث ہے یا قدیم و ازلی ہے، اِس موضوع پر فلاسفہ اور دانشوروں میں بڑی بحث پائی جاتی ہے۔ بعض اِسے قدیم اور ازلی کہتے ہیں، یعنی وہ ہمیشہ سے تھا، اور ایک بڑا گروہ اسے حادث شمار کرتا ہے۔ اور جو دلائل یہ لوگ پیش کرتے ہیں اُن میں سرفہرست یہ ہے کہ ازلی اور ابدی سوائے ایک کے اور کوئی نہیں اور وہ صرف خدا کی پاک ذات ہے، اور اُس کے علاوہ ہر چیز حادِث اور مخلوق ہے اور اُس سے وابستہ ہے۔ مادّی دنیا کے حُدوث کا عقیدہ رکھنے والے حضرات کبھی فلسفی دلائل پیش کرتے ہیں اور کبھی علمی دلائل سے استفادہ کرتے ہیں۔ حرکت اور سُکون کے فلسفی دلائل میں سے معروف ترین دلیل ہے کہ ساری مادّی دنیا ہر وقت حرکت اور سُکون کی حالت میں ہے اور حرکت و سُکون حادِث اُمور میں سے ہیں۔ اور جو چیز حادثات کے معرض میں ہو، وہ حادِث ہوتی ہے۔

اس دلیل کو ایک مزید اور پختہ تعبیر کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ مادّی دنیا ہر وقت حالتِ تغیر میں ہے اور یہ تغیر اور تبدیلی خود حدوث کی علامت ہے۔ کیونکہ اگر وہ ازلی بھی ہو اور ساتھ ہی ساتھ اُس میں تبدیلیاں اور حادثات بھی واقع ہوتے رہیں تو یہ حدوث اور قدم کا ایک ساتھ ہونا کہلائے گا۔ یعنی بیک وقت حادِث بھی ہے اور قدیم بھی، جس کا لازمہ یہ بنتا ہے

کہ ہم تغیرات اور تبدیلیوں کو جو کہ اُمورِ حادثہ میں سے ہیں، اُنہیں ازلی شمار کریں اور یہ کھلا تناقص ہے۔ دلیل حرکتِ جوہری کو قبول کرتے ہوئے یہ دلیل زیادہ واضح اور روشن ہے کہ ''حرکت تمام اشیاء کی ذات میں چھپی ہوئی ہے بلکہ ان کی عینِ ذات ہے، کیونکہ حرکت کا وجود ایک امر حادِث ہے، جو ازل کے معنی نہیں رکھتا۔ (غور کیجیے) یہ دلیل تحقیق طلب ہے اور فلسفی موضوع ہے، جہاں تک علمی دلائل کی بات ہے تو اُس میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ ساری مادّی دنیا مسلسل فرسودگی اور اختتام پزیر ہونے کی حالت میں ہے اور بے حساب علمی دلائل نے اِس فرسودگی کو ثابت کیا ہے کہ تمام سیّارے، کہکشائیں، زمین اور جو کچھ زمین پر ہے، یہ سب اِس قانون کے زمرے میں آتے ہیں۔ یہ مستقل فرسودگی اِس بات کی دلیل ہے کہ اس مادّی دنیا کی ایک انتہا ہے اور اسے ختم ہونا ہے، کیونکہ فرسودگی بغیر انتہا کے چلتی رہے یہ نہیں ہوسکتا، یعنی فرسودگی اُس شے کو کبھی نہ کبھی مکمل طور پر ختم کردے گی اور اس طرح فرسودگی بھی ختم ہوجائے گی۔

اور جب ہم نے یہ مان لیا کہ اختتام اور انتہا ہے، تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ کوئی نہ کوئی آغاز بھی ہوگا، کیونکہ اگر کوئی چیز ابدی نہیں ہے تو یقیناً ازلی بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ ابدیت بے انتہا ہونے کے معنی رکھتی ہے اور جو چیز بے انتہا ہے وہ لامحدود ہے اور لامحدود شے کا کوئی آغاز نہیں، اِس بنا پر جو چیز اَبدی نہیں ہے وہ ازلی بھی نہیں ہوگی۔ اس بات کو اِس مثال کے ذریعے سے واضح کیا جاسکتا ہے کہ یہ جہان اَزلی ہے اور فرسودگی کی حالت میں بھی ہے تو پھر اِس فرسودگی کو اب تک مادّی دنیا کی عمر ختم کردینی چاہیے تھی۔ کیونکہ بے انتہا فرسودگی عدم کے برابر ہے۔ پھر ایک اور تعبیر کے مطابق جو جدید علمی نظریات میں سے ہے، جہاں مادّہ رفتہ رفتہ ایک جیسا بنتا جارہا ہے۔

سارے ایٹم بتدریج پھٹتے اور اِنرجی (Energy) میں بدلتے جارہے ہیں اور تمام اِنرجی آہستہ آہستہ ایک جیسی ہوتی جارہی ہے، بالکل ایسے کہ ایک آگ کا شعلہ کسی کمرے میں جلایا جائے اور یہ آگ کا مادّہ گرمی میں تبدیل ہوجاتا ہے اور یہ گرمی اور حرارت، آہستہ آہستہ کمرے میں ہر طرف پھیل کر ایک سی ہوجاتی ہے۔ اگر کبھی دنیا میں بے انتہا وقت گزرا ہوگا، تو یہ تمام حالتیں بھی واقع ہوئی ہوں گی، مثلاً تمام مواد کا اِنرجی میں تبدیل ہونا اور پھر اِنرجی کا ہر طرف پھیل کر ایک جیسا ہوجانا۔

بہر حال اس بات کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ کوئی ایسا وقت بھی گزرا ہو کہ خدا کی کوئی مخلوق نہیں تھی اور اُس کی فیّاض ذات، بے فیض رہی ہو، بلکہ اس کے برخلاف یہ سوچا جاسکتا ہے کہ خدا کی ہر وقت کوئی نہ کوئی مخلوق رہی ہے اور یہ تمام مخلوقات ہر وقت تغیر اور تبدّل کی زد میں رہی ہیں اور یہ تمام مخلوقات اُس کی پاک ذات سے تعلق رکھتی تھیں یا دوسری تعبیر کے مطابق اِن میں حدوث ذاتی تھا، نہ کہ حُدوث زَمانی۔ کیونکہ سب کے لیے حدوثِ زمانی کا تصوّر نہیں کیا جاسکتا۔ (غور کیجیے) اور یہ جملہ روایات میں آیا ہے کہ ''کَانَ اللّٰہُ وَلَا شَیْئَ مَعَہُ'' خدا ہمیشہ سے تھا اور اُس کے ساتھ کوئی چیز نہ تھی۔ اِس کا مقصد یہی ہے کہ

اُس کی ذات پاک کے ساتھ نہیں تھی، بلکہ اُس کی مخلوق تھی۔(غور کیجیے)[۱]

چھٹا حصّہ

فَأَجْرٰی فِیْهَا مَاءً مُتَلَاطِمًا تَیَّارُهُ مُتَرَاکِمًا زَخَّارُهُ حَمَلَهُ عَلَی مَتْنِ الرِّیْحِ الْعَاصِفَةِ وَ الزَّعْزَعِ الْقَاصِفَةِ فَأَمَرَهَا بِرَدِّهِ وَ سَلَّطَهَا عَلَی شَدِّهِ وَ قَرَنَهَا إِلَی حَدِّهِ الْهَوَاءُ مِنْ تَحْتِهَا فَتِیقٌ وَ الْمَاءُ مِنْ فَوْقِهَا دَفِیقٌ.

''اوران کے درمیان ایسا پانی بہادیا جس کی لہروں میں تلاطم اوراس کی موجیں تہ بہ تہ تھیں، اسے ایک تیز وتند ہوا کے کاندھے پر لاد دیا اور پھر ہوا کو الٹنے پلٹنے سے روکے رکھنے کا حکم دیا اوراس کی حدوں کو پانی کی حدوں سے یوں ملا دیا کہ نیچے ہوا کی وسعتیں تھیں اوراوپر پانی کا تلاطم۔''

شرح وتفسیر

پانی، سب سے پہلی مخلوق

امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہما السلام کے کلام سے جو کچھ اِس باب میں اور جو کچھ آئندہ کے ابواب میں مِلتا ہے ، وہ دراصل اِس دنیا کے طرزِ تخلیق کے بارے میں وضاحت ہے کہ خداوند عالم نے سب سے پہلے پانی یا پانی جیسا کوئی مائع خلق کیا اور اُسے تیز ہواؤں کے دوش پر سوار کر دیا۔اس تیز طوفانی ہوا کی یہ ذمّے داری تھی کہ وہ اِسے محفوظ رکھے اور اِسے پھیلنے اور منتشر ہونے سے بچائے اور اِسے اس کے خاص حدود میں روکے رکھے۔پھر ایک اور تیز طوفانی ہوا بنائی، جس کا کام تھا کہ اُس بہت سارے اور جوشیلے پانی کی موجوں اور لہروں کو مزید جوشیلا اور متلاطم بنائے اور اُس تیز ہوا نے اِن لہروں کو آپس میں خوب ٹکرایا جس کے نتیجے میں وہ لہریں اور مزید اونچی لہروں میں تبدیل ہوگئیں اور موجیں اتنی بلند ہوئیں، کہ فضا میں ایک کے پیچھے ایک اُڑیں اور اُن سے سات آسمان خلق ہوئے۔

یہ بات تو واضح ہے کہ پانی، ہوا، اور طوفان وغیرہ جیسے الفاظ (اُس وقت جب نہ کوئی پانی تھا نہ طوفان، نہ ہوا تھی اور

---

[۱] توحید صدوق، ص ۶۶، اس مضمون کی طرح کی بحث، ص ۱۴۵ اور صفحہ ۲۲۶ پر بھی آئے گی۔اس آخری اور نتیجہ خیز تحریر کو پڑھتے ہوئے عظمت محمدؐ وآل محمد علیہم السلام پر غور کریں۔(مترجم)